راجستھان کے
چند مشاہیرِ ادب سے تحریری گفتگو
مرتبہ
نذیرؔ فتح پوری
ناشر:
راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی۔ جے پور

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

۱

راجستھان کے چند مشاہیر ادب
سے تحریری گفتگو

مرتب / مصنف

نذیر فتح پوری

ناشر:

راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور

نام کتاب	:	راجستھان کے چند مشاہیر ادب سے تحریری گفتگو
نام مرتب/مصنف	:	نذیر فتح پوری، پونہ۔09822516338
سن اشاعت	:	2016ء
تعداد اشاعت	:	500
اشاعت	:	باراول
سائز	:	23x36=16
قیمت	:	-/250 روپے
طباعت	:	گلوبل کمپیوٹرس اینڈ پرنٹرس، رام گنج بازار، جے پور
موبائل	:	9460866130,9460257861
آئی ایس بی این نمبر	:	ISBN - 978-96-6022719-5
ناشر	:	شاہد احمد جمالی۔9928262983

راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور

انتساب

راجستھان کے پہلے محقق

حافظ محمود شیرانی

کے نام

نذیرؔ فتح پوری

فہرست

☆

پیش لفظ

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

علامہ اقبال کا یہ شعر بچپن سے ہی پڑھتا آ رہا ہوں۔ اساتذہ نے اس کے معنی بھی سمجھائے تھے اور وہی معنی آج تک ذہن میں ہیں۔ لیکن حقیقی طور پر اس شعر کا مطلب مجھے تب معلوم ہوا جب ہندوستان کے ایک مشہور و معروف شاعر اور ادیب جناب نذیر فتح پوری صاحب سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ گو یہ ملاقات صرف چند لمحوں پر مشتمل تھی۔ میں نے صرف اپنا نام بتایا تھا اور مصافحہ کیا تھا۔ لیکن ان کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی، جو ذہنی طور پر مجھ پر حاوی ہوگئی۔ یہ ملاقات ۳ / مارچ ۲۰۱۶ ء کو ٹونک میں اے پی آر آئی کے ایک سالانہ پروگرام میں ہوئی تھی۔ چند لمحوں میں جو اخلاقی جملے ان کی زبان سے نکلے، ان میں ایسی تاثیر تھی، ایسی شیرینی تھی کہ میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ذرہ برابر غرور نہیں، تمکنت نہیں۔ ایک خاموش بیکراں سمندر کی طرح ان کی طبیعت ہے، سامنے والے کی بات سننا اور خود خاموش رہنا۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو ہر ایک شخص میں نہیں ہوتی ہیں۔ یہ ایسی سرسری ملاقات تھی کہ مجھے یقین ہے کہ نذیر صاحب کو یاد بھی نہ رہا ہوگا کہ شاہد نام کا کوئی شخص ان سے ملا تھا۔

چند لمحوں کی اس ملاقات کے کچھ دن بعد میں نے اپنی چند کتب راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی کے سکریٹری جناب شکیل الرحمٰن صاحب کے ذریعہ نذیر فتح پوری صاحب کو پیش کیں۔ اس وقت نذیر صاحب جے پور ریلوے اسٹیشن پر پونہ جانے والی ٹرین میں تشریف فرما تھے۔ پونہ پہنچتے پہنچتے انھوں نے میری کئی کتب کا جائزہ لے لیا تھا۔ ہر کتاب کا جائزہ لیکر مجھے فون کرتے رہے اور بہت دیر تک مجھے اپنے مفید مشوروں

سے نوازتے رہے۔

آئندہ چند دنوں میں آپ نے مجھے اپنی ڈھیر ساری کتب عنایت کیں۔ ابھی تک تو میں نے صرف ان کے بارے میں سنا تھا، لیکن اب اپنی آنکھوں سے ان کی ادبی خدمات کو نہار رہا تھا۔ نذیر صاحب کی تصنیف و تالیفات کی تعداد کم و بیش ستر ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتب عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔

نذیر صاحب کے اس بے نیازانہ ادبی کام کو میں دیکھتا رہ گیا۔ نہ شہرت کے پیچھے بھاگنے کی تمنا، نہ اپنے کیئے ہوئے کام پر گھمنڈ، نہ اپنے آپ کو اردو ادب کا سرتاج کہلانے کا شوق، نہ کسی کی مخالفت کی پرواہ، نہ کسی کی مخالفت سے غصہ میں آکر کوئی غیر معیاری قدم اٹھانا۔ یہ سب چیزیں نذیر صاحب کی سرشت میں نہیں ہیں۔ میں ابھی تک راجستھان میں صرف ان حضرات کو ہی اردو کا خادم سمجھتا رہا تھا جو یہاں میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ لیکن نذیر صاحب کی خدمات دیکھ کر میرے دل کی آنکھیں کھل گئیں اور ظاہری آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہٹ گیا۔ اور یہ سمجھ میں آ گیا کہ اگر خدمت کا جذبہ ہے تو ہندوستان کے کسی بھی کونے سے کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

چند دنوں میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اور نذیر صاحب ایک دوسرے سے ناواقف نہیں ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ ہر دوسرے دن یا تو نذیر صاحب کا فون آتا ہے یا میں انھیں فون کر لیتا ہوں۔ نذیر صاحب نے جس طرح میری حوصلہ افزائی کی ہے، اس طرح آج تک کسی نے بھی نہیں کی تھی۔ راجستھان کے تعلق سے انھوں نے مجھے ایسا قیمتی مواد عنایت کیا جو راجستھان میں کسی کے بھی پاس نہیں ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ بالمشافہ گفتگو ہمارے درمیان ابھی تک نہیں ہوئی، سوائے ان چند لمحوں کی ملاقات کے۔

رمضان سے پہلے نذیر صاحب کا فون آیا کہ وہ راجستھان کے چند مشہور و معروف حضرات کے انٹرویو لینا چاہتے ہیں جو راجستھان میں بڑے پیمانہ پر کام کر رہے ہیں۔ اور ان کو مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع بھی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً لبیک

کہا۔ کیونکہ میری ناقص معلومات کے مطابق راجستھان میں ابھی تک کسی نے ایسا قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ چند حضرات کون ہیں۔ جب نذیر صاحب نے بتایا کہ وہ حضرات کون ہیں اور ان میں میں بھی شامل ہوں تو میں کچھ حیران سا ہوگیا۔ کہ اتنے بڑے بڑے مشاہیر کے درمیان میری کیا حیثیت ہے۔ لیکن نذیر صاحب نے فرمایا کہ ان کو میرا انٹرویو ہر حال میں چاہئے۔ آخر نذیر صاحب نے مجھے ایک سوال نامہ عنایت کیا۔ اس کو پڑھ کر مجھے لگا کہ ان سوالات کے ذریعہ میں اپنے دل کی بات آسانی سے کہہ پاؤنگا۔ چنانچہ میں نے نذیر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور سوالوں کے جوابات تحریر کر کے ان کو بھیج دئے۔ جب ان کو سبھی حضرات کے جوابات موصول ہو گئے تو فون پر مجھے فرمانے لگے کہ اس کتاب کو اگر راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی شائع کریگی تو انھیں خوشی ہو گی۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اکیڈمی کے سیکریٹری شکیل الرحمٰن صاحب سے بھی گفتگو کی۔ انھوں نے بھی اپنی رضامندی کا اظہار کردیا۔ اس طرح زیرِ نظر کتاب ہماری اکیڈمی کے ذریعہ شائع کی جارہی ہے۔ اور مجھے فخر ہے کہ اس بہانہ سے مجھے نذیر فتح پوری صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

اگر غور کیا جائے تو یہ کتاب صرف چند اشخاص کے انٹرویو کی ہی کتاب نہیں ہے بلکہ راجستھان کی ادبی دنیا کا ایک ایسا باب ہے جس میں قدیم اور جدید نظریات کا سنگم، ادبی اختلافات اور ہم آہنگی، تحقیق و تنقید کا سفر، سوانحی حالات و کوائف اور تلاش و جستجو کی چاہ کے آثار نمایاں طور پر نظر آتے ہیں اور یہ سب نذیر صاحب کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ راقم کو یقین ہے کہ راجستھان کے ادب نواز حضرات کو نذیر فتح پوری صاحب کی یہ کاوش ضرور پسند آئے گی۔

شاہد احمد جمالی
صدر
راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور

گفت باہمی

نذیر فتح پوری

جن اہلِ علم و قلم نے راجستھان میں اردو تحقیق و تنقید اور تخلیق و ترسیل کا وقار بلند کیا ان کے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔ہم نے اپنے موضوع کے لحاظ سے اس فہرست میں سے چند ستارے منتخب کئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اپنے کار ہائے نمایاں سے راجستھان کے آسمان ادب کو نہ صرف روشن کیا بلکہ اپنے فکر و فن کی روشنی اردو کے دور دراز علاقوں تک پہنچائی۔ یہ چند ستارے ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، خداداد خاں مونس، ڈاکٹر فیروز احمد، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، اور شاہد احمد جمالی کے نام سے ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ہم نے ان حضرات کو ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے تناظر میں جدا جدا سوالات ارسال کئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جوابات میں تنوع نظر آتا ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ سبھی حضرات نے ہمارے سوالات کے مدلل، مفصل اور منظم جوابات دئے۔ان تمام جوابات کے متن کو یکجا کر کے دیکھیں تو ادبی طور پر راجستھان کا ایک نیا اور قابلِ قدر چہرہ ابھر کر سامنے آئیگا۔اہلِ فکر و نظر کے لئے یہ کتاب باحوالہ ثابت ہوسکتی ہے۔بطور خاص ان پانچوں حضرات کے خاندانی کوائف اور بزرگوں کے کارناموں کی فہرست بھی اس کتاب کے حوالہ سے ہمارے سامنے آئے گی۔اور ان کے اپنے ادبی کاموں کا بھرپور گوشوارہ بھی ان جوابات کی روشنی میں نظر آئے گا۔

یہ سچ ہے محقق کا مزاج منصفانہ ہونا چاہئے۔ہٹ دھرمی اور بے جا انا پسندی تحقیق کا اصول نہیں۔ایسی باتیں انسان کے لئے رسوائی کا سبب بن جاتی ہیں۔کوئی یہ تصور نہ کرے کہ اس نے جو تلاش کرلیا وہ آخری نقش کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔یا اسے جوں کا توں قبول کرلیا جائے۔بعد کی تحقیق آپ کے دریافت کردہ نقش سے آگے بھی جاسکتی

ہے۔ایک خزانہ آپ کے پاس ہے تو دوسرا اور تیسرا خزانہ کسی اور کے پاس بھی ہو سکتا ہے۔کوئی اور بھی آگے جا سکتا ہے۔لیکن جو آگے جاتا ہے اس کا بھی اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ نقش اول کے متلاشی کو حقیر نہ جانے۔نقش اول کے متلاشی کا رتبہ کم نہیں ہے۔اس کی ہمت ہے کہ اس نے نقش قائم کیا۔جو کسی بھی عمارت میں بنیاد کا پہلا پتھر نصب کرتا ہے وہ بھی عمارت سازی میں برابر کا حصہ دار ہے۔کیفی اعظمی نے کہا تھا۔ع۔

''میں اگر تھک گیا دوسرا تو چلے''

تحقیق ایسا راستہ ہے جس پر مسافر کو چاہئے کہ مسلسل چلتا رہے۔کیونکہ آج کا نیا کل کے لئے پرانا ہو جاتا ہے۔یہی احساس مسافر کو مہمیز کرتا ہے۔اور نوادرات سے مسافر کا دامن مالا مال ہوتا رہتا ہے۔

ردّ و قبول تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے لیکن اس کے لئے تاریخ اور ماخذات کے حوالوں کی ضرورت ہے تحقیق ہوا میں تیر چلانے کا نام نہیں۔ایک دلچسپ واقعہ جو میں نے افسانچہ کے طور پر لکھا تھا۔یاد آ گیا۔

''ایک نام نہاد محقق نے دوسرے نام نہاد محقق سے کہا۔''یہ جو آسمان میں روشنی کا گولہ نظر آتا ہے، یہ چاند نہیں ہے۔''دوسرے محقق نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا''یہ سو فی صد چاند ہے۔''پہلے نے کہا۔''لیکن میں اسے ہرگز چاند نہیں مانتا،میری تحقیق آج تک کی تحقیق سے جدا ہے۔''دوسرے نے سوال کیا۔''کیا ہے آپ کی تحقیق۔یہ چاند نہیں تو کیا ہے۔''

پہلے نے کہا''میری تحقیق کے مطابق یہ چاند نہیں بلکہ ماہتاب ہے۔''

لیجئے صاحب ہو گئی تحقیق،چاند کو ماہتاب کہہ کر آپ کی تلاش و تحقیق کے جذبہ کی تسکین ہو گئی۔ہو گیا سر بلند آپ کا۔آپ صف اول کے محقق بن گئے۔ظاہر ہے سنجیدہ اور متین محققین ایسی بے تکی باتوں سے گریز کرتے ہیں۔

یہ دیکھ کر واقعی خوشی ہوتی ہے کہ راجستھان کے محققین سنجیدگی سے اپنے کاموں کو

انجام دے رہے ہیں۔اس کے باوجود کہیں کہیں کچھ کمی، کوتاہی، ان دیکھی اور تساہل درمیان میں آجاتے ہیں۔کبھی کبھی کوئی دبی دبی سی مخالفت بھی سرابھارتی ہے۔کہیں کوئی انا بھی، درمیان میں آجاتی ہے۔کوئی منفی جذبہ بھی نمایاں ہونے لگتا ہے۔لیکن یہ خیال رہے کہ تحقیق جذبات کی تسکین کے لئے نہیں ہوتی، حقیقت کشائی کے لئے ہوتی ہے۔ایک بار ماہر غالبیات علامہ کالی داس گپتا رضا نے فرمایا تھا ''تحقیق ہمارے اپنے خلاف بھی جاتی ہو تو اس کا اظہار کرنا چاہئے۔''

کسی نے کہا تھا علم جب بولتا ہے، جہاں سے بولتا ہے اور جس مقدار میں بولتا ہے اپنی افادیت ثابت کر دیتا ہے۔زیر مطالعہ کتاب میں شامل تمام اہلِ علم وقلم کے جوابات اس بات کا ثبوت ہیں۔

آیئے ہم سب مل کر راجستھان کے تحقیقی افق پر نئے سورج اگائیں، نئی روشنی سے نئی نسل کو روشناس کرائیں۔اور اپنے پیچھے ایسے نقوش چھوڑ جائیں کہ...

بقول جگر.....

راہ وفا میں نقش ایسے چھوڑ آیا ہوں
کہ دنیا دیکھتی ہے اور مجھ کو یاد کرتی ہے

نذیر فتح پوری

۲۴/جون۔۲۰۱۶ء

مشاہیر کے ناموں کی ترتیب تاریخ پیدائش کے لحاظ سے کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی	۱۹۳۶ء	خداداد خاں مونس	۱۹۳۸ء
ڈاکٹر فیروز احمد	۱۹۵۱ء	ڈاکٹر عزیز اللہ	۱۹۵۴ء
شاہد احمد جمالی	۱۹۵۸ء		

ڈاکٹر ابولفیض عثمانی

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی سے میرے پہلی ملاقات ۱۹۹۲ء میں جے پور میں اس وقت ہوئی تھی جب راجستھان اردو اکیڈمی نے مجھے ایوارڈ دیا تھا۔تب عثمانی صاحب اکیڈمی کے سیکریٹری تھے۔مسلم مسافر خانہ میں وہ مجھ سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔تب وہ جوان تو نہیں تھے مگر جوانوں سے کسی طرح کم بھی نہیں تھے۔ایک بڑا سا چرمی بیگ اٹھائے وہ مسلم مسافر خانہ کی دوسری منزل کے اس کمرے میں آئے جہاں میرا قیام تھا۔میں ان دنوں راجستھان کے اہل علم وقلم سے زیادہ واقف نہ تھا۔عثمانی صاحب سے متعلق مجھے ڈاکٹر اظہار مسرت نے بتایا تھا۔عثمانی صاحب ایک محنتی ادیب اور ذمہ دار استاد کے ساتھ ساتھ ایک محقق کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔چھریرا سا بدن دراز قد پتلون قمیض زیب تن کئے ہوئے۔چہرے پر ڈاڑھی نہیں تھی البتہ آنکھوں پر چشمہ چڑھا تھا۔وہ چشمہ آج بھی موجود ہے۔صرف نمبروں کے حساب سے شیشہ بدلتا رہا اور ان بدلتے شیشوں کے توسط سے انھوں نے راجستھان کے پوشیدہ ادبی خزانوں سے گراں قدر جواہر پارے تلاش کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔عمر کی اس بلندی پر جہاں پہنچ کر انسان ساری ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر صرف سکون کی زندگی جینے کا خواہش مند ہوتا ہے۔عثمانی صاحب آج بھی تازہ دم ہیں۔تحقیق ان کا محبوب و مرغوب موضوع ہے۔اس موضوع پر ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ادبی رسائل میں ان کے تحقیقی مضامین کثرت سے شائع ہو چکے ہیں۔

عثمانی صاحب چونکہ درس تدریس کے شعبہ کے مرد میدان رہے ہیں۔اس لئے آج بھی وہ تشنگان علم و ادب کی رہبری اور رہنمائی سے گریز نہیں کرتے۔بطور خاص راجستھان سے متعلق تحقیقی کام کرنے والوں کی معاونت کیلئے وہ اپنے آپ کو ہمہ وقت تیار رکھتے ہیں۔میری جب فون پر ان سے گفتگو ہوتی ہے۔تو وہ راجستھان کے تعلق سے پورا تحقیقی دفتر کھول کر رکھ دیتے ہیں۔۔آج بیاسی سال کی عمر میں بھی ان کا ذہن تازہ

ہے۔ بیدار ہے۔ ابھی چند ماہ قبل میں نے فون سے رابطہ کیا تو ابراہیم ذوق کا فارسی قصیدہ سنا دیا۔ ایک بار حکیم یوسف کی وہ غزل سنا دی جو غالب کی غزل کا راجستھان ترجمہ تھی۔ مکمل غزل مطلع تا مقطع۔

عثمانی صاحب کا تعلق راجستھان کے علمی ادبی گھرانے سے ہے۔ ادب کے ایسے خاندانی سلسلے اب مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو زبان کا دائرہ محدود ہوتا جا رہا ہے تو اس کے شیدائیوں کا سلسلہ بھی سمٹ رہا ہے۔ تاہم عثمانی صاحب اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوئے ہیں۔ ان کا شوق اور جذبہ آج بھی جوں کا توں قائم ہے۔

عثمانی صاحب سے دوسری بار بھی راجستھان اردو اکیڈمی کے انعامی جلسے ہی میں ملاقات ہوئی۔ یہ ۲۰۱۳ء کی بات ہے۔ جب میری شاعری کے مجموعہ ''تتلیوں بھرا آسمان'' پر اکادمی کی جانب سے مجھے انعام تفویض کیا گیا تھا۔ عثمانی صاحب اس انعامی تقریب کے مہمان تھے۔ میں نے دیکھا راجستھان کے مختلف علاقوں سے آنے والے نوجوان طلبہ نے انہیں گھیر رکھا تھا۔ اور عثمانی صاحب ہر ایک کے سوال کا جواب دے رہے تھے۔ عثمانی صاحب سے تیسری ملاقات یکم مارچ ۲۰۱۶ء کو ٹونک راجستھان میں اس وقت ہوئی جب مولانا آزاد عربک پرشین انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے تین روزہ سیمینار کا افتتاحی اجلاس تھا۔ یہاں بھی مجھے انعام سے نوازا گیا تھا۔ عثمانی صاحب یہاں بھی مہمان تھے۔ جلسے کے اختتام پر ان سے ملاقات ہوئی۔ حالانکہ وہ چلنے پھرنے کی حالت میں نہ تھے لیکن ان کا شوق اور جذبہ دونوں سلامت تھے اور وہ فراخ دلی کے ساتھ لوگوں سے مل رہے تھے۔

اردو ادب اور تحقیق کے حوالے سے مجھے عثمانی صاحب ایک عوامی کردار کے حامل نظر آئے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے سوالوں کا موصوف نے مدلل اور مفصل جواب مرحمت فرمایا۔ اور طالب علموں کے لئے نئے دریچے وا کئے۔

نذیر فتح پوری

۲۵/ جولائی ۲۰۱۶ء

ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی سے گفتگو

سوال۔ ا۔ آپ کا تعلق ایک علمی وادبی گھرانے سے ہے۔ اپنے آبا واجداد کے ادبی کارناموں سے متعلق کچھ بتائیں۔

جواب۔ میری آبائی نسبت حضرت عثمان سے ہے جو حضورؐ کے خلیفہ سوم تھے۔ ان کے صاحبزادے حضرت آبان کی پندرہویں پشت میں شیخ دانیال قطری سلطان قطب الدین ایبک کے دور میں قطر سے ہندوستان آئے تھے۔ عہد شمس الدین میں ان کو بدایوں کے عہدہ قضاۃ پر فائز کیا تھا۔ شیخ دانیال کی چودھویں پشت میں قاضی امین الدین کو شاہ عالم کے عہد (۱۷۴۸ء۔۱۸۰۶ء) میں شہر نارنول کے عہدہ قضاۃ واستفسار پر مامور کیا گیا تھا۔ جہاں آزادی کے زمانے تک ہمارے خاندان کی پانچ پشتیں گزریں۔ علم وادب کا سلسلہ جاری رہا۔ انیسویں صدی کے وسط میں سب سے پہلے میرے جدامجد مولانا احتشام الدین شوکت کے سگے ماموں مولانا رشیدالدین فائز کو راجہ رام سنگھ (۱۸۳۵ء۔۱۸۸۰ء) نے جے پور بلوا کر سرکاری مدرسہ میں عربی وفارسی کے مدرس کے عہدہ پر مامور کیا۔

مولانا رشیدالدین فائز کے بعد ان کے بڑے بھانجے مولانا سلیم الدین تسلیم بھی جے پور آ گئے تھے۔ اور مذکورہ مدرسے میں عربی وفارسی کے مدرس ہوئے۔ مولانا عبدالحق لکھتے ہیں۔ ''اہل درس کا میدان اورئینٹل کالج تھا۔ مولوی رشیدالدین اور مولوی سلیم الدین کا اس مدرسہ سے سرکاری طور پر تعلق تھا اور ان دونوں عالموں کا دولت خانہ آستانہ درس تدریس بنا ہوا تھا۔'' (بحوالہ جائزہ زبان اردو۔ ص۔۴۴)

مولانا تسلیم کے بعد ان کے برادران اور دیگر بہت سے عزیز واقارب بھی یکے بعد دیگرے نارنول سے جے پور آ گئے تھے۔۔ ان میں میرے جد امجد مولانا احتشام الدین شوکت بھی تھے جو مولانا تسلیم کے چھوٹے بھائی تھے۔ جے پور آ کر

ریاست کے محکمہ پولس میں کورٹ انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔اسی زمانے سے جے پور میں میرے آباواجداد علمی وادبی خدمات انجام دیتے رہے۔مولوی عبدالحق نے دس ایسے قدیم ممتاز علما فضلا کے اسمائے گرامی کی ایک فہرست جائزہ زبان اردو میں درج کی ہے۔جنھوں نے جے پور میں اردو زبان کی ترقی واشاعت میں نمایاں حصہ لیا تھا۔اس فہرست میں اول الذکر بالترتیب حسب ذیل علما ہمارے ہی خاندان کے ہیں۔

۱۔ مولانا رشیدالدین فائز ۲۔ مولوی سلیم الدین تسلیم

۳۔ مولوی سلطان الدین مبین ۴۔ مولوی کرامت علی اعجاز

۵۔ قاضی محمد حسن رضی

مذکورہ سب حضرات صاحب تصنیف عالم و فاضل اور قادر الکلام شاعر تھے۔ مولانا تسنیم ۱۸۵۱ء میں سیرت پاک کے موضوع پر عقود ثلثہ کے عنوان سے اپنی پہلی کتاب تصنیف کی۔اس کے بعد عربی اور فارسی اور اردو نثر ونظم میں مختلف موضوعات پر درجنوں کتابیں لکھیں۔تشریح القران، تربات کربلا، نظم الدرر وغیرہ کے علاوہ علم بلاغت کی تصنیف دفتر الشعرا اور منظوم تاریخی وتنقیدی تصنیف حدیقہ المذہب (۱۸۸۱ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ڈاکٹر محمد حسین ،صدر شعبہ اردو، گورمنٹ کالج بیکانیر نے دفتر الشعرا کو مولانا نجم الغنی کی تصنیف بحر الفصاحت سے قبل کی تصنیف قرار دیا ہے۔مولانا تسلیم کی بیشتر تصانیف کے اصل نسخے اے پی آر آئی ٹونک کے شاغل گلگشن کی زینت ہیں۔

مولانا تسلیم اور ان کے خاندان کو یہ فخر حاصل ہوا ہے کہ جے پور میں اس خانوادے کی تین پشتوں میں ایسے عالم و فاضل پیدا ہوتے رہے جن کے علمی و ادبی کارناموں کو اہل تحقیق نے مقالات کا موضوع بنایا اور راجستھان کی مختلف یونیورسٹیوں سے پی ایچ ڈی اور ایم فل کی ڈگریاں حاصل کیں۔پہلی پشت میں مولانا سلیم الدین تسلیم، مولانا سلطان الدین مبین، مولانا احتشام الدین شوکت۔دوسری پشت میں مولانا احترام الدین شاغل، مولانا اسا الدین تسنیم۔تیسری پشت میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی۔

سوال ۔۲۔آپ کو گھر کے صحن میں علم وادب کا ماحول ملا۔ظاہر ہے اسی ماحول میں آپکی ذہنی تربیت ہوئی۔آپ بتائیں کہ آپ نے عمر کے کس حصہ میں لکھنے کی ابتدا کی اور سب سے پہلے آپ کے قلم کی کاوش کس روپ میں قرطاس کی زینت بنی۔

جواب۔مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میں نے لکھنے کی ابتدا کس تاریخ کو کی تھی۔مگر میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے خاندان میں بچے کی تسمیہ خوانی کے ساتھ ہی اس کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔حروف شناسی اور ابتدائی درسی قاعدے کی تکمیل کے بعد سی پارے کی تعلیم کے ساتھ تختی پر حروف تہجی کی مشق کا بھی آغاز کرادیا جاتا تھا اور آہستہ آہستہ اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ کاپی پر لکھنے کی مشق بھی شروع کرادی جاتی تھی۔اس طرح خود میں نے بھی بہت چھوٹی عمر میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔محرم اور بارہ وفات کے موقع پر گھر کے بچوں سے ان کی ہمت افزائی کے لئے سلام اور نعتیں پڑھوائی جاتی تھیں۔جو ان ہی کے نام سے بزرگ لکھ کر دیا کرتے تھے۔چنانچہ میں نے بھی کئی سال تک سلطان تخلص کے ساتھ کئی سال اپنا کلام پڑھا جو حقیقت میں والد لکھ کر دیا کرتے تھے۔اس کی بیاض میرے پاس محفوظ ہے۔اس میں سب سے پہلی نعت ۱۰/اپریل ۱۹۴۱ء کو منعقدہ مناعتہ کی لکھی ہوئی ہے۔بعد میں میں نے اپنا تخلص سلطان کی بجائے والد صاحب کے تخلص کے وزن پر کامل تبدیل کر لیا تھا۔اس کے بعد جو کچھ بھی کہتا وہ بھی اسی بیاض میں لکھ لیا کرتا تھا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ میرا شبدیز قلم صفحہ قرطاس پر ۱۹۴۱ء سے یقیناً اپنی جولانیاں دکھانے لگا تھا۔اس زمانہ میں میری عمر ۶۔۷ سال کی تھی۔

سوال ۔۳۔آپ کی پہلی تخلیق کب کہاں اور کس رسالہ میں شائع ہوئی۔

جواب۔میرا پہلا مضمون بعنوان تعارف مسلم ہائی اسکول جے پور کے میگزین کا شمارہ نمبر بابت ۱۹۵۲ء میں چھپا تھا۔میں نے ۱۹۵۱ء میں مسلم ہائی اسکول سے ریگولر طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔۱۹۵۲ء میں مہاراجہ کالج جے پور میں انٹرمیجیٹ کا طالب علم تھا۔نیز میں نے آزادی سے قبل ۱۹۴۶ء میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے

پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فارسی کا امتحان منشی اور ۱۹۴۷ء میں منشی فاضل پاس کرلیا تھا۔
سوال ۔۴۔ ملازمت کے دوران بھی اور ملازمت سے سبک دوشی کے بعد بھی آپ مسلسل کاوش قرطاس وقلم میں مصروف ہیں۔ میری نظر میں آپ نے کبھی نہ تھک نے ہالا ذہن پایا ہے۔اس توانائی اور تازگی کا سبب؟
جواب ۔جیسا کہ سطور بالا میں تحریر کیا جا چکا ہے میں نے بہت کم عمری میں آزادی سے پہلے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کئے تھے۔اوران کی تیاری خود والد صاحب نے کروائی تھی ۔وہ اس زمانہ میں ریاست جے پور کے محکمہ پولیس میں سرکل انسپیکٹر تھے جب انھیں کہیں انسپیکشن کے لئے جانا ہوتا تھا تو کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔وہاں بھی مجھے بیکار بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔کچھ نہ کچھ تحریری کام کرواتے رہتے تھے۔اس کے علاوہ مجھے منشی رام چندر خوش نولیس سے خوش نویسی کا فن سیکھنے کوملا۔ممکن ہے تحریری مشق کے باعث دیر تک تحریری کام کر نے کی عادت سی ہوگئی ہو۔اور لکھنے پڑھنے میں تھکن محسوس نہ ہوتی ہو۔
سوال ۔۵۔آپ نے تحقیق وتنقید کے حوالے سے راجستھان میں بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے اور بطور خاص جے پور اور ٹونک کی بنیادوں کو ادبی طور پر آپ نے بہت اندر تک کھنگالا ہے۔آپ سے پہلے اس کی مثال کم ملتی ہے۔کیا یہ سچ ہے۔
جواب ۔صوبہ راجستھان کی تشکیل آزادی کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں عمل میں آئی۔ چونکہ ریاست جے پور سے میرا آبائی تعلق تھا،لہٰذا تشکیل راجستھان سے قبل صوبائی سطح پر تو اردو تحقیق وتنقید سے متعلق کوئی کام نہیں ہوا تھا۔البتہ ریاست جے پور میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے متعلق کچھ تحقیقی اور تنقیدی کام کیا جا چکا تھا۔اس سلسلے میں تحقیق کے نقطۂ نظر سے پروفیسر محمود شیرانی کے مضمون بعنوان دائرہ کے مہدویوں کا اردو کی ترویج میں حصہ،سب سے پہلے اورینٹل کالج میگزین لاہور بابت ۱۹۳۶ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا تھا۔جس میں انھوں نے تاریخ غریبی کی نشاندہی کی تھی اور اسے دائرہ

(شیخاواٹی، ریاست جے پور) کے مہدویوں کی ۱۷۴۸ء کی تصنیف قرار دیا تھا۔اس پر راقم الحروف نے بھی تحقیق کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس کے مصنف محمد جی میاں غریب تھے۔ تاریخ غریبی کے علاوہ پروفیسر محمود شیرانی نے دائرہ کے مہدویوں کی دیگر تخلیقات کی نشان دہی بھی کی ہے۔ جو قصبہ دائرہ میں لکھی گئی تھیں۔ان کے لکھنے والے حضرات قصبہ بیانہ سے دائرہ میں آئے تھے۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد مولوی عبدالحق کی کتاب جائزہ زبان اردو (۱۹۴۰ء) شائع ہو کر منظر منظر عام پر آئی جس میں راجپوتانہ کی مختلف ریاستوں میں اردو زبان کی ترویج سے متعلق اعداد و شمار کی روشنی میں مختلف نوعیت کے سوالات کے ذریعہ ایک جائزہ لیا گیا ہے۔اس کتاب کا موضوع ریاستوں میں اردو زبان کی ترویج ہے۔ادبی تحقیق اس کا موضوع نہیں ہے۔تا ہم ادبی تحقیق کے لئے جائزہ زبان اردو میں تحقیقی خامیوں، کمزوریوں اور چند غلطیوں کے باوجود مختلف ماخذ تلاش کئے جاسکتے ہیں۔اس کے بعد پرفیسر عبدالغنی سابق صدر شعبہ فارسی مہاراجہ کالج جے پور کا ایک تحقیقی مضمون جے پور میں اردو کا تدریجی زمانہ کانپور کے ستمبر ۱۹۴۳ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔جس میں مختلف عنوانات کے تحت جے پور میں اردو کی ترویج پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس مضمون کا دائرہ بھی صرف ریاست جے پور تک ہی محدود ہے۔

تشکیل راجستھان کے بعد اردو تحقیق سے متعلق تذکرہ شعرا جے پور، مولانا احترام الدین شاغل، (۱۹۵۸ء) اور بہار سخن ،تذکرہ شعرا جودھپور، شرف الدین یکتا (۱۹۶۳ء) کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔مگران دونوں تذکروں میں صرف شعرا کا ذکر ہے اور وہ بھی صرف جے پور اور جودھپور تک ہی محدود ہے۔ان کے علاوہ صوبائی سطح پر انجمن ترقی اردو، جودھپور کے زیر اہتمام ایک کل راجستھان سمپوزیم بعنوان راجستھان میں اردو ادب کے سو سال، جودھپور میں ۱۹۶۴ء میں منعقد ہوا تھا۔جس میں راقم نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا تھا۔اس سے قبل ایک اردو کنونشن ۱۹۵۶ء میں جے پور میں بھی منعقد کیا گیا

تھا۔ جس میں قاضی معراج دھول پوری نے اپنا مقالہ بعنوان ترقی اردو میں اہل راجستھان کا حصہ، پیش کیا تھا۔ حقیقت میں ان مقالات میں بھی صوبائی سطح پر راجستھان میں اردو تحقیق کی صرف جھلک نظر آتی ہے۔ مذکورہ تحقیق کارناموں کے علاوہ تشکیل راجستھان کے بعد اس صوبہ میں شعرا کے چند تذکرے بھی شائع ہوکر منظر عام پر آئے۔ ان میں پرفیسر پریم شنکر شری واستو کا مرتبہ تذکرہ راجستھان کے موجودہ اردو شاعر (دیوناگری رسم الخط میں۔ ۱۹۶۶ء) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مگر اس میں بھی راجستھان کے مختلف اضلاع کے صرف معاصر شعرا کا ذکر ہے۔ تشکیل راجستھان کے بعد اس صوبہ میں صوبائی سطح پر سندی تحقیق کے لئے راقم نے اپنا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ راجستھان میں اردو زبان وادب کے لئے غیر مسلم حضرات کی خدمات، مرتب کر کے ۱۹۷۰ء میں راجستھان یونیورسٹی، جے پور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالہ میں راقم الحروف نے پہلی بار راجستھان کی قدیم دیسی ریاستوں میں اردو زبان وادب کا ریاست وار جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ہر ریاست کے غیر مسلم شعرا وادبا کی شخصیت اور سوانح حیات کے ذکر کے ساتھ ان کے منظوم ومنثور ادبی کارناموں کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد راجستھان میں اردو زبان وادب کی تاریخ سے متعلق مختلف موضوعات پر راقم الحروف کی تصانیف وتالیفات شائع ہوتی رہیں۔

۱۔ راجستھان میں اردو زبان وادب ۱۸۵۷ء تک — ۱۹۹۲ء

۲۔ مشرقی راجپوتانہ کے قدیم ادبی مراکز الور، بھرتپور، اور دھولپور — ۲۰۰۶ء

۳۔ راجستھان کی ادبی تاریخ کے چند اردو مآخذ — ۲۰۰۷ء

۴۔ اردو نا ٹک، اودھ سے راجپوتانہ تک — ۲۰۱۰ء

۵۔ سابق ریاست جے پور میں اردو شعر وادب کا ارتقاء۔ — ۲۰۱۳ء

۶۔ کہانی تاریخی چبوترے کی۔ — ۲۰۱۴ء

ان تصانیف کے علاوہ مطبوعہ مقالات ومضامین اور ریڈیائی تقاریر کی طویل

فہرست ہے۔

سوال ٦۔آپ نے تخلیق کے بجائے تحقیق کے خارزاروں میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیسے کیا۔

جواب۔١٩٦٤ء میں جب میں جودھپور سمپوزیم کے لئے اپنا مقالہ بعنوان راجستھان میں اردو زبان وادب کے سو سال، مرتب کر رہا تھا۔تو اس صوبہ کی مختلف ریاستوں کے غیر مسلم حضرات نے راجستھان میں جو گرانقدر ادبی کارنامے انجام دئے ہیں ان کو منظر علم پر آنا چاہئے۔اس سے نہ صرف اس حقیقت کو تقویت ملیگی کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ اس کے ارتقا وفروغ میں غیر مسلم بھی شانہ بشانہ رہے۔اور یہ کام ہندوستان کے ہر خطہ میں ہوتا رہا ہے جس میں راجستھان بھی شامل ہے۔نیز اس تحقیق سے قومی یکجہتی کے نظریہ کو بھی تقویت ملیگی۔اپنے اس خیال کا اظہار والد مولانا شاغل مرحوم سے کیا تو موصوف نے میری ہمت افزائی فرماتے ہوئے اس موضوع پر تحقیقی کام کرنے کی تائید کے ساتھ تاکید بھی فرمائی۔اور کہا کہ اگر ممکن ہو تو اس موضوع پر کسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرو۔اچھا موضوع ہے۔اس کے لئے اپنے کتب خانہ میں بھی کچھ مواد مل سکتا ہے۔اور راجستھان کی قدیم لائبریریوں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔نیز ابھی راجستھان میں ایسے غیر مسلم حضرات کے قدیم گھرانے موجود ہیں جن کے بزرگوں میں نامور ادیب اور شاعر ضرور ہوئے ہونگے۔ان کی تخلیقات بھی ان کے گھرانوں میں مل سکتی ہیں۔والد صاحب کی تائید نے میرے خیالات پر مہمیز کا کام کیا۔اس زمانہ میں میں گورنمنٹ کالج میں اردو کا لکچرر تھا۔اور راجستھان میں صرف ایک ہی یونیورسٹی راجستھان یونیورسٹی جے پور تھی مگر اس میں بھی صرف بی اے تک برائے نام اردو کی تعلیم کی سہولت فراہم تھی۔اردو میں ایم اے کی تعلیم راجستھان میں کہیں نہیں تھی۔پی ایچ ڈی کا تو تصور بھی نہیں تھا۔ایسے حالات میں میں نے راجستھان کے باہر کی مختلف یونیورسٹیوں کے شعبہ اردو کے صدور صاحبان سے رابطہ قائم کیا مگر کسی بھی یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر پی ایچ ڈی کرنے اجازت نہیں ملی۔بالآخر بڑی جد وجہد کے بعد راجستھان یونیورسٹی جے پور ہی

نے مجھے بحیثیت لکچرار اردو ضمنی ایچ ڈی کرنے کی اجازت تو دیدی۔ مگر یونیورسٹی کے مختلف قوائد وضوابط کی تکمیل کے لئے بڑی دقتیں پیش آئیں راجستھان میں اس زمانہ میں ایکسٹرنل گائڈ کا تقرر پی ایچ ڈی کے لئے نہیں تھا۔ اسی طرح مقالہ کا ہندی یا انگریزی ٹائپ ہونے کی شرط وغیرہ۔ ان تمام دشواریوں کو بھی حل کیا۔ اسی زمانے سے میرا ادبی رجحان راجستھان میں شعروادب سے متعلق تحقیق کی جانب بڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہی موضوع میدان تحقیق بن گیا۔ اور ذہن تحقیق کی جانب رجوع رہا۔

سوال ۷۔ تاریخ غریبی سب سے پہلے کس نے تلاش کی۔ آج تو ہر جگہ اس کے حوالے مل جاتے ہیں۔ لیکن ابتدا کیسے ہوئی۔ کیا اسے شیخاواٹی کی تصنیف قرار دیا جاسکتا ہے۔۔

جواب۔ تاریخ غریبی کی سب سے پہلے پروفیسر محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون بعنوان دائرہ کے مہدویوں کا اردو ترویج میں حصہ (۱۹۳۶ء) میں نشاندہی کی تھی۔ اور تاریخ غریبی کو 'دائرہ' (شیخاواٹی) کے مہدویوں کی تصنیف قرار دیا تھا۔ اگرچہ پروفیسر شیرانی نے اس تصنیف کے آغاز کا ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۴۷ء بھی بتایا ہے۔ مگران کے پاس کتاب کا جو نسخہ ہوگا وہ غالباً نامکمل ہوگا اس لئے کتاب کے اختتام کا سنہ اور مصنف کا پورا نام بھی نہیں لکھا۔ کتاب میں غریب، عاجز الفاظ کے استعمال کی بنا پر مصنف کا صرف تخلص غریب قرار دیا تھا۔ پروفیسر شیرانی کے بعد راقم الحروف نے تاریخ غریبی پر مزید تحقیقی کام کیا اس کے مصنف کا نام محمد جی میاں غریب تلاش کیا جنھوں نے مذکورہ کتاب دائرہ (شیخاواٹی) میں نہیں بلکہ قصبہ بیانہ علاقہ بھرتپور میں ۱۷۴۷ء اور ۱۷۵۲ء کے دوران تصنیف کی تھی۔ ایسی صورت میں تاریخ غریبی کو شیخاواٹی کی تصنیف پرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی تفصیلات راقم الحروف نے اپنی تصنیف مشرقی راجپوتانہ کے قدیم ادبی مراکز الور، بھرتپور اور دھولپور، مطبوعہ ۲۰۰۶ء کے صفحہ نمبر ۲۰۶ سے ۲۰۸ پر درج ہیں۔

سوال۔ ۸۔ کیا راجستھان میں تخلیق اور تحقیق کے کے میدان میں خاطر خواہ کارہائے نمایاں انجام دیا جاچکا ہے یا اس خزانہ میں ہنوز ہیرے جواہرات پوشیدہ ہیں۔

جواب۔ جہاں تک راجستھان میں ادبی تخلیق کا سوال ہے وہ راجستھان کے ادیب وشاعر بلاتفریق مذہب وملت مختلف موضوعات پر مشتمل اردو نظم ونثر میں تقریباً دوسو برس سے انجام دے رہے ہیں جس کے معیار کا تعین اہل تحقیق وتنقید ہی کر سکتے ہیں۔اور راجستھان میں تحقیق وتنقید کا سلسلہ اگر چہ آزادی سے پہلے شروع ہو چکا تھا مگر حقیقت یہ کہ تشکیل راجستھان کے بعد اولاً علاقائی سطح پر بھی توجہ کی جانے لگی۔ایسی صورت یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ راجستھان کے ادبی خزینہ پر ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔اور خاص طور پر راجستھان کے شہروں کے چھوٹے بڑے ادبی مراکز سے قطع نظر قصباتی علاقے ہنوز تشنہ تحقیق ہیں۔مثال کے طور پر شیخاواٹی کا علاقہ جہاں اٹھارویں صدی میں فرقہ مہدویہ کے ارباب علم وادب باہر سے آکر فروکش ہوئے تھے اور خواجہ نجم الدین نجم جیسے اولین دور کے باکمال ادیب اور شاعر انیسویں صدی کے آغاز میں اسی علاقہ میں پیدا ہوئے۔۔جنکی بالخصوص نثری تصانیف پر خاطر خواہ تحقیقی کام نہیں ہوا۔

سوال۔۹۔عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو سے راجستھانی بولیوں نے استفادہ کیا ہے۔یعنی اردو کی تشکیل میں راجستھانی بولیوں کا اہم کردار ہے دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو سے راجستھانی بولیاں مستفید ہوئی ہیں۔آپ کیا فرماتے ہیں۔

جواب۔ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ جہاں تک اردو کی تشکیل میں راجستھانی بولیوں کے کردار کا تعلق ہے،اس کے لئے تاریخی شواہد وحقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی کے حسین و دل کش اور لطیف و شیریں لفظیات نے ہندوستانی زبان (کھڑی بولی) کے قوائد اور افعال وصفات کے ساتھ مل کر جس زبان کو جنم دیا وہی آگے چل کر اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔اور جہاں بھی فارسی بولنے والے حضرات پہنچے وہاں وہاں کی مقامی زبانوں کے اثرات بھی ان حضرات نے قبول کئے۔اور اس طرح ہندوستان کے مختلف خطوں کی زبانوں کے الفاظ کسی نہ کسی نوعیت سے نوتشکیل زبان میں شامل ہوتے رہے۔

اکبراعظم کا زمانہ آتے آتے اس عمل میں گرانقدر اضافہ ہوا اور چونکہ وہی زمانہ اردو کی لسانی تشکیل کے عروج کا زمانہ تھا لہٰذا اس دور میں راجستھانی بولیوں کے الفاظ کا اردو کی تشکیل میں نمایاں کردار رہا اور راجستھانی بولیوں کے الفاظ و محاورات غیر شعوری طور پر اردو میں شامل ہوتے رہے۔ اکبراعظم کے زمانہ میں حکومت کا پایہ تخت آگرہ تھا جس کی مغربی سرحد راجستھان سے ملحق تھی۔ لہٰذا لسانی اثرات غیر شعوری طور پر نوتشکیل زبان پر بھی پڑتے رہے۔ مذکورہ اسباب کی بنا پر اکبراعظم کے زمانہ سے راجستھانی بولیوں کے الفاظ کا اردو زبان میں نمایاں اضافہ ہونا ایک فطری امر تھا۔

سوال کا دوسرا حصہ یعنی اردو سے راجستھانی بولیاں مستفید ہوئیں، بھی حقیقت پر مبنی ہے۔ جس کا ثبوت راجستھان کی مختلف بولیوں میں شامل الفاظ سے ملتا ہے۔ ایسی بولیاں دیہاتی علاقوں میں آج بھی بولی جاتی ہیں۔ اس موضوع پر ماہر لسانیات کے علاوہ راجستھان کے ہندی اور اردو کے چند ادیبوں نے بھی ثبوت فراہم کئے ہیں۔ خود آپ کی تصنیف ''اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر'' مطبوعہ ۲۰۱۱ء ہمارے پیش نظر ہے۔

سوال ۔۱۰۔ راجستھان کے الگ الگ علاقوں میں الگ الگ بولیاں بولی جاتی ہیں آپ کس علاقہ کی بولی کو خالص راجستھانی سمجھتے ہیں۔

جواب ۔ اگرچہ راجستھان کے مختلف علاقوں میں علاقائی ناموں کی نسبت سے الگ الگ بولیاں بولی جاتی ہیں مگر ان میں سے سرحدی علاقوں کی بولیاں مثلاً میواتی، برج بھاشا، میواڑی اور بھیلی وغیرہ بولیوں پر ملحقہ دوسرے صوبوں کے علاقوں کی بولیوں کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض علاقوں کی بولیوں کا دائرہ صرف مقامی حد تک محدود ہے۔ مثلاً ڈھونڈاری اور ہاڑوتی وغیرہ۔ اور یہ سب بولیاں راجستھانی بولی کی مختلف شکلیں ہیں۔ جنکی قدیم ادبی شکل ڈنگل اور پنگل میں نظر آتی ہے۔ راجستھان کی تمام بو لیوں میں علاقائی وسعت اور قدامت کے علاوہ ادبی تصانیف کے تعلق سے مارواڑی زبان کو میرے خیال میں خالص راجستھانی بولی کہا جا سکتا ہے جس میں میرا کے بھجن بھی

ہیں، جان کوی کی قائم راسا اور دوسری تصانیف بھی ہیں۔تاج بی بی کی کویتائیں بھی ہیں اور آج بھی مارواڑی زبان میں جس طرح کتابیں لکھی اور چھپی جارہی ہیں، نیز راجستھان کے باہر ہندوستان بھر میں باالخصوص مغربی بنگال اور مہاراشتر وغیرہ میں راجستھان کی مارواڑی بولی نے اپنی جو پہچان بنائی ہے وہ شاید اس صوبہ کی کسی دوسری بولی کو حاصل نہیں۔اس کے علاوہ یہ زبان مارواڑ کی نہ صرف دیہی بستیوں میں بلکہ وہاں کے شہروں میں بھی عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔لہٰذا میرے خیال میں مارواڑ کی علاقائی بولی کو خالص راجستھانی کہا جاسکتا ہے۔

سوال ۔۱۱۔مرحوم حکیم یوسف جھن جھنوی نے دیوان غالب کا راجستھانی میں ترجمہ کیا ہے یہ منظوم ترجمہ ہے کیا ''غالب راجستھانی میں'' آپ کے مطالعہ میں آیا ہے۔کیا حکیم یوسف نے دیوان غالب کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

جواب ۔جی ہاں حکیم یوسف مرحوم کا راجستھانی زبان میں منظوم ترجمہ میرے علم میں ہے۔۱۹۹۰ء میں جھن جھنوں میں منعقدہ جشن سالک عزیزی کے موقع پر حکیم یوسف مرحوم نے اس میں سے ایک غزل کا منظوم ترجمہ خود مجھے سنایا تھا۔جس کا مطلع یہ ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئینگے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

ترجمہ۔

من ہی تو ہے نہ کانکڑو پیڑا سے نہ تڑ پھڑاوے کیوں
رو واں کے مھیں ہجار بر مھاں نے کوئی رلاوے کیوں

اگرچہ مذکورہ غزل کے منظوم ترجمہ میں ترجمہ نگار نے مقامی بولی میں اس غزل کے وزن اور ردیف قافیہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے مگر یہ کیفیت عام طور پر دوسری غزلیات میں نظر نہیں آتی۔نیز یہ ترجمہ منتخب غزلیات کا ہے نہ کہ مکمل دیوان غالب۔البتہ اس کے بارے میں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مارواڑی زبان میں غالب کے کلام کے منظوم ترجمہ کی ایک

شعوری کاوش ہے اس کے ذریعہ مارواڑی زبان بولنے والے حضرات بھی کلام غالب سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

سوال۔۱۲۔راجستھان میں اردو ذریعہ تعلیم کی صورت حال کیا ہے۔کیا مشاعروں جلسوں اور سیمیناروں کے برپا کرنے سے اردو کا مستقبل محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

جواب۔راجستھان میں پرائمری سطح پر مادری زبان کی حیثیت سے اردو کے ذریعہ تعلیم کی اجازت ضروری ہے مگر عملی طور پر اس کا فقدان نظر آتا ہے۔اردو زبان کی نصابی کتابیں پڑھانا ذریعہ تعلیم نہیں ہوتا۔دوسرے مضامین بھی سوائے ہندی اور انگریزی کے اگر اردو زبان میں پڑھائیں جائیں تو تو اردو کو ذریعہ تعلیم کہا جا سکتا ہے۔مگر حقیقت میں اسکولوں میں عملی طور پر اردو کو ذریعہ تعلیم کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔نہ دوسرے مضامین کی کتابیں اردو میں دستیاب ہیں۔ان کے پڑھانے والے اساتذہ موجود ہیں۔

اگر چہ آج کے مشاعرے،ادبی جلسے اور سیمینار وغیرہ ادبی وثقافتی اہمیت سے زیادہ تفریح،شہرت اور حصول زر کا وسیلہ بنتے جارہے ہیں،بالخصوص مشاعرے تو 'گڈ ول' یافتہ شعرا کی آمدنی کا بڑا ذریعہ بن گئے ہیں اور اسی کے ساتھ در پردہ بعض ایجنٹ حضرات کا مفاد بھی ان سے وابستہ رہنے لگا ہے۔اور کبھی کبھی کسی خاص مقصد کے حصول اور شہرت کے لئے بھی مشاعروں کا انعقاد کیا جانے لگا ہے۔مگر اس کے باوجود مشاعروں اور سیمیناروں کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔زبان کی ترسیل اور کسی قدر ابلاغ کے ساتھ عوام میں اردو شاعری کی مقبولیت کو اردو کے مستقبل کا ضامن کہا جا سکتا ہے۔بالخصوص بڑے عوامی مشاعروں سے قطع نظر ادبی نشست کے نام پر چھوٹے چھوٹے مشاعرے منعقد کئے جاتے ہیں ان کے ذریعہ نو جوان شعرا کو اپنی شعری صلاحیتوں کے بروئے کار لانے اور اپنے ذوق سخن کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ بزرگوں سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔اور اس طرح کاروان شعروسخن اپنے مستقبل کی منزل کی جانب رواں رہتا ہے۔

جہاں تک سیمیناروں کا تعلق ہے وہ مشاعروں کی طرح عوامی دلچسپی کے جلسے

نہیں ہوتے۔نہ وہ سامعین کوتفریح کا سامان فراہم کرتے ہیں نہ مقالہ نگاروں کے لئے شعرا کی طرح آمدنی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔البتہ ان کے ذریعہ جہاں تک ایک طرف ادبی تحقیق وتنقید کے ساتھ تخلیق کو بھی تقویت ملتی ہے وہیں نو جوانوں کے ذوق ادب کو بروئے کارلانے کا موقع بھی ملتا ہے۔مگر صحیح رہبری اور رہنمائی کے بغیر مقصد حاصل نہیں ہوتا۔بہر حال مشاعروں اور سیمیناروں کے ذریعہ اردو کے مستقبل کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔

سوال۔۱۳۔کیا یہ سچ ہے کہ آزادی کے بعد راجستھان میں اردو تحقیق کو آپ نے بہت روشن کیا۔کیا دوسرے محققین نے آپ کی تحقیق کو بسر وچشم تسلیم کیا۔

جواب۔راجستھان میں صوبائی سطح پر اردو شعر و ادب کی تحقیق سے متعلق میرے مضامین و مقالات کی طباعت کا سلسلہ۱۹۶۲ء میں شروع ہو گیا تھا۔اس کے بعد میری تحقیقی تصانیف و تالیفات کتابی صورت میں۱۹۸۴ء سے شائع ہو کر منظر عام پر آنے لگیں۔تقریباً تیس سال تک راجستھان میں اہل تحقیق بالخصوص ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے والے نو جوان اسکالرز ان سے استفادہ بھی کرتے رہے۔اور تحقیقی معلومات کو آگے بھی بڑھاتے رہے مگر اس وقت تک کسی بھی محقق نے کسی نوعیت کا کوئی اختلاف نہیں کیا۔

۱۹۹۲ء میں میری ایک تحقیقی کتاب بعنوان راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ء تک،شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔اس میں ایک موضوع سے اختلاف کرتے ہوئے پہلی بار ٹونک کے اکبر شہابی صاحب نے مرمت خاں مرمت کو گل سے پہلے کا صاحب دیوان شاعر قرار دیا تھا۔جس کی تردید ڈاکٹر شان فخری کے پی ایچ ڈی کے مقالہ سرونج کی ادبی خدمات،مطبوعہ۱۹۹۹ء کی تحقیقات سے ہو جاتی ہے۔

اس کے دس سال بعد ڈاکٹر فیروز احمد صاحب نے کلیات افضل بہادر پوری (مرتبہ،ڈاکٹر نعیم نقوی،مطبوعہ کراچی۔۱۹۸۹ء) کے حوالہ سے اپنے ایک مضمون (مشمولہ ادبی مجلّہ،شعبہ اردو و فارسی،راجستھان یونیورسٹی،جے پور۔۲۰۰۹ء) میں گل سے پہلے کے شاعر میر فضل علی افضل بہادر پوری (۱۶۶۴ء۔۱۷۳۷ء) کے دو دواوین (مرتبہ۸۹۔

۱۶۸۸ء) اور (۳۵-۱۷۳۴ء) کی نشان دہی کی ہے اور میری تحقیق کو آگے بڑھایا ہے۔مذکورہ مجلّہ کی اشاعت کے چار سال بعد فیروز صاحب کی ایک اہم تحقیقی کتاب راجستھان میں اردو (۲۰۱۳ء) شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔اس کتاب میں بھی فیروز صاحب نے میری بعض تحقیقات پر تبصرہ اور تنقید بھی کی ہے۔اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔کچھ باتوں کو تسلیم کیا ہے اور چند باتوں سے اختلاف کیا ہے۔مثلاً قصہ رنگیں گفتار، مصنفہ عظمت اللہ نیاز سے متعلق میرے اس بیان سے اختلاف کیا ہے کہ وہ جے پور میں ۱۸۱۱ء میں لکھی گئی تھی۔اور اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی کی تصنیف تاریخ ادب اردو کے حصہ سوم کا حوالہ بھی دیا ہے۔مگر موصوف خود بھی یہ ثابت نہیں کر سکے کہ وہ کتاب کہاں لکھی گئی تھی، جبکہ عظمت اللہ نیاز نے دہلی سے جے پور آنے کے بعد اس کتاب کی تصنیف کا ذکر کیا ہے اور جے پور آنے کے بعد کہیں واپس جانے کا ذکر نہیں کیا ہے۔نیز جمیل جالبی نے عظمت اللہ نیاز کے جس شاگرد کا حوالہ دیا ہے اور ان کو مولوی عابد علی نارنولی کا نبیرہ بتایا ہے ان کا تعلق بھی جے پور ہی سے تھا۔بہر حال جب تک مزید معلومات فراہم نہیں ہو جاتیں درایت کی رو سے قصہ رنگین گفتار کو جے پور کی تصنیف تسلیم کرنا ہوگا۔

میری تحقیق سے اختلاف کے اسی نظریہ کی آواز بازگشت شاہد احمد جمالی کی مرتب کردہ کتاب راجستھان کے منتخب تحقیقی وتنقیدی مضامین، مطبوعہ ۲۰۱۶ء میں بھی سنائی دیتی ہے۔

فیروز صاحب نے اپنی مذکورہ تصنیف میں میری چند اور تحقیقات سے بھی اختلاف کیا ہے مثلاً موصوف نے میری تحقیق محاصرہ رنتھمبور، مصنفہ گردھاری لال سارستھ کو اس کی طرز نگارش کے باعث افسانوی ادب میں شمار کیا ہے جب کہ میں نے اس کو قلعہ رنتھمبور کی تاریخ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور خود مصنف نے بھی مذکورہ کتاب کو قلعہ کی تاریخ بتایا ہے۔

اسی طرح میں نے جے پور کے قدیم افسانوی تصانیف کو ان کے مصنفین کے

بیانات کے حوالوں سے ناول یا افسانہ لکھا ہے۔ فیروز صاحب ان کو افسانہ یا ناول تسلیم نہیں کرتے۔ نیز میری تحقیق کے مطابق عطا حسین شور کی تصنیف گلدستہ پرستان، راجستھان میں لکھا جانے والا پہلا روایتی ناٹک ہے جبکہ فیروز صاحب کا قیاس ہے کو اس سے پہلے بھی کوئی ناٹک لکھا گیا ہوگا۔ اسی اختلافی سلسلہ میں ڈاکٹر فیروز صاحب نے راجستھان کی اولین نثری تصنیف سے متعلق میری تحقیق قصہ رنگیں گفتار (۱۸۱۱ء) سے پہلے اٹھارویں صدی کے اختتامی زمانہ میں تمامی قصہ پرتھی راج کا، لکھے جانے کی بات کہی ہے۔ اور اس کے لئے اس نامکمل قلمی نسخہ کا حوالہ بھی دیا ہے جس کے نہ تو ابتدائی صفحات موجود ہیں نہ اختتامی ۔نہ مصنف کا نام معلوم ہے نہ مقام تصنیف کا پتہ ۔محض قیاسی دلائل مثلاً کاغذ، سیاہی، طرز تحریر اور لسانی شواہد کی بنا پر موصوف نے اس کو اٹھارویں صدی کے آخری زمانہ کی تصنیف قرار دیا ہے جبکہ یہ کتاب راجستھانی زبان میں لکھے ہوئے پرتھوی راج کے ایک قصہ کا اردو ترجمہ ہے اور پرتھوی راج کا وہ قصہ راجستھانی زبان میں لکھے ہوئے قصہ بعنوان پدماوتی سمے، سے ماخوذ ہے جس کا اردو ترجمہ نواب محمد خاں بہادر دلاور نواز جنگ کی ایما پر ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۴ء میں میر عباس علی نے حیدر آباد دکن میں کیا تھا۔ نواب محمد خاں قائم خانی تھے اور ریاست حیدر آباد میں ملازم تھے

(بحوالہ، امعان وابتغا، مجموعہ مضامین ڈاکٹر محمد حسین مطبوعہ ۲۰۱۶ء ص۔۴۳،)

بہر حال مذکورہ چند اختلافات کے علاوہ میری تحقیقات سے متعلق کسی دوسرے محقق کے اختلافی بیانات میری نظر سے نہیں گزرے۔ تاہم اختلافات کا ہونا ایک فطری امر ہے اور اگر وہ صحیح ہوں تو ان کو تسلیم کرنا چاہئے۔ ان ہی کے ذریعہ تحقیق آگے بڑھتی ہے۔

سوال ۔۱۴۔ مختلف مضامین کے حوالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے آبا و اجداد نے راجستھان میں تحقیق وتنقید میں ابتدائی نقوش مرتب کئے تھے۔ بعد کی تحقیق نے انھیں خطوط پر اپنی تلاش کے قافلہ کو رواں رکھا اور نام کمایا۔ آپ اپنے بزرگوں سے متعلق مختصراً

معلومات فراہم کریں۔

جواب۔ میرے بزرگ انیسویں صدی کے وسط میں نارنول (پنجاب) سے جے پور آ گئے تھے اور تشکیل راجستھان کے زمانہ (مارچ ۱۹۴۹ء) تک ان بزرگوں نے راجستھان میں جو علمی وادبی کارنامے انجام دئے ہیں ان کے شواہد راجستھان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتب ورسائل وغیرہ میں موجود ہیں۔ جس کا حوالہ اس سوال نامہ کے سوال نمبر (۱) کے جواب میں تحریر کیا جا چکا ہے۔ اور اپنے بزرگوں کے کارناموں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ تشکیل راجستھان کے بعد سب سے پہلے میرے والد مرحوم الحاج مولانا احترام الدین شاغل نے تذکرہ شعرائے جے پور (۱۹۵۸ء) لکھ کر جے پور میں ادبی تحقیق کی راہیں کھولیں اور ان کے بعد راقم الحروف نے صوبائی سطح پر ۱۹۷۰ء میں اپنا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ مرتب کر کے یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور بزرگوں کی ادبی روایات کو صوبائی سطح پر آگے بڑھانے کی کوشش کی اور راجستھان میں صوبائی سطح پر تحقیق وتلاش کی راہیں کھولیں۔ ان ہی خطوط پر راجستھان میں تحقیق کا قافلہ آگے بڑھنے لگا۔ ارباب علم وادب ان سے مستفیض ہوتے ہیں اور اہل تحقیق کے لئے وہ مشعل راہ ثابت ہوئے۔

سوال۔۱۵۔ دوسرے علاقوں کی طرح آجکل راجستھان میں بھی پی ایچ ڈی کا کام تھوک کے حساب سے چل رہا ہے۔ کیا شعراء اور ادباء کے فن اور شخصیت پر ریسرچ کی سند حاصل کرنے سے اردو کا بھلا ہوگا۔ اردو کے پاس ریسرچ کے جدید موضوعات کیوں نہیں ہیں۔

جواب۔ آزادی سے پہلے راجستھان کی ادبی تاریخ پر گمنامی کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اور اس صوبہ میں اردو میں ریسرچ تو کیا ایم اے کی تعلیم کا بھی فقدان سا تھا۔ اگر چہ آزادی سے پہلے تک جے پور میں ایم اے (اردو) کی تعلیم برائے نام موجود تھی مگر ۱۹۴۷ء تک وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ راقم الحروف نے راجستھان کی تشکیل کے بیس سال بعد ۱۹۷۰ء میں راجستھان یونیورسٹی جے پور سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی اس کے

بعد اس صوبہ میں ایم اے اردو کی تعلیم کا بھی سلسلہ شروع ہوا اور اس کے دس سال بعد بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے زمانہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے تحقیق کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ اور وہ اتنی تیزی سے بڑھنے لگا، جیسے تحقیق کی باڑھ آ گئی ہو۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جیسے جیسے راجستھان کی یونیورسٹیوں میں اور کالجوں میں ایم اے اردو کی تعلیم کا شوق بڑھنے لگا اور دوسری جانب پی ایچ ڈی کے نگراں حضرات کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اس کو تقویت پہنچائی۔ ریسرچ اسکالرز کو پی ایچ ڈی کے ذریعہ اپنا تابناک مستقبل دکھائی دینے لگا۔ اس کے علاوہ پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی کام کے دوران یو.جی سی اور یونیورسٹی کی جانب سے ملنے والی فیلوشپ اور اسکالرشپ بھی ریسرچ کے شوق کو مہمیز لگاتی رہی۔ اور نگراں حضرات کے لئے ریسرچ اسکالرز کی رہنمائی ان کی ملازمت کے لئے ضروری قرار دی جانے لگی۔ غرض مختلف موضوعات پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے تحقیقی کام کیا جانے لگا۔

اگر راجستھان کی تمام یونیورسٹیوں کے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات کے عنوانات کی فہرست مکمل طور پر سامنے آئے تو ان کے موضوعات میں تنوع کا پتہ لگایا جا سکتا ہے جن میں شعراء وادباء کے فن اور شخصیت کے علاوہ جدید موضوعات بھی شامل ہیں۔

راجستھان میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے ریسرچ کے بڑھتے ہوئے شوق کی وجہ سے معیار برابر گھٹتا رہا اور ریسرچ اسکالرز اپنے پیش رؤں کی کاوشات کو معمولی ردو بدل کے ساتھ اپنانے لگے۔ اس کے ذمہ دار صرف ریسرچ اسکالرز ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے نگراں حضرات بھی ہیں جو اپنے اسکالرز کی کوئی رہنمائی نہیں کرتے بلکہ ان کے کام کو دیکھنے کی بھی ان کے پاس فرصت نہیں ہوتی۔ ایسے حضرات ریسرچ گائڈ کی حیثیت سے ریسرچ اسکالرز کی رہبری کا حق ادا نہیں کرتے۔

مذکورہ امور کے علاوہ ریزرویشن کا فائدہ اٹھانے والے اسکالرز کا رجحان بھی تیزی سے ریسرچ کی جانب بڑھا ہے۔ جہاں تک شعراء اور ادباء کے فن اور شخصیت سے

متعلق موضوعات کا تعلق ہے ان کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر ایسے موضوعات پر تحقیق نہ کی جائے تو ادب کی تاریخ کے بہت سے گوشے گمنامی کے پردوں سے باہر نہ آئیں۔ خاص طور پر علاقائی ادب کی تاریخ ایسے موضوعات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسے موضوعات اردو ادب کی تاریخ کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ آجکل راجستھان میں اردو تحقیق کا کام جس تیزی سے بڑھنے لگا ہے اسی تیزی سے معیار گرنے لگا ہے۔ اس پر توجہ کی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ کام نگراں حضرات کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

سوال ۔۱۶۔ اب تک آپ کی کس کس موضوع پر کون کون سی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ تاریخ و ترتیب سے بتائیں۔

جواب ۔ میری تصانیف و تالیفات اور تراجم وغیرہ کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ ۱۹۶۳ء سے جاری ہے۔ اگر چہ یہ سب کتابیں مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں مگر بنیادی طور پر راجستھان میں اردو شعر و ادب کی تحقیق سے متعلق موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جس کا اندازہ میری حسب ذیل مطبوعات سے کیا جا سکتا ہے۔ جن کی سنہ وار ترتیب اشاعت کے ساتھ پیش ہے۔

۱۔ ۱۹۶۳ء۔ ترقی پذیر راجستھان۔ اردو ترجمہ ''وکاس نمکھ راجستھان''۔ حکومت راجستھان کی ترقی یاتی اسکیموں پر مشتمل کتابچہ۔

۲۔ ۱۹۶۴ء۔ قلم کی تلواریں۔ (دیوناگری رسم الخط) شعرائے راجستھان کے، قومی اور وطن کلام کا مجموعہ۔ ناشر راجستھان ساہتہ اکیڈمی۔ اودے پور

۳۔ ۱۹۷۸ء۔ راجستھان میں اردو۔ راجستھان میں اردو کی ترویج پر مشتمل کتابچہ۔ ناشر، محکمہ تعلقات عامہ، حکومت راجستھان، جے پور

۴۔ ۱۹۷۸ء۔ ریاست وار فہرست اساتذہ اردو جامعہ ہند بشمول یونیورسٹیز و متعلقہ کالیجیز۔ ناشر شعبہ اردو، گورمنٹ کالج، ٹونک

۵۔ ۱۹۷۹ء۔روداد سہ روزہ اردو کانفرنس،انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند(دہلی) منعقدہ دسمبر ۱۹۷۸ء۔زیر اہتمام شعبہ اردو،گورمنٹ کالج،ٹونک۔بشمول تلخیص مقالات۔ناشر۔ادارہ،اخبار ندیم۔ٹونک

۶۔ ۱۹۸۴ء۔راجستھان میں فارسی زبان و ادب کے لئے غیر مسلم حضرات کی خدمات(تحقیق)۔ناشر۔اے پی آر آئی۔ٹونک

۷۔ ۱۹۸۴ء۔اردو ریڈر برائے درجہ پنجم۔(نصابی کتاب)ناشر،راجستھان راجیہ پستک منڈل۔جے پور

۸۔ ۱۹۸۵ء۔راجستھان میں اردو زبان و ادب کے لئے غیر مسلم حضرات کی خدمات(تحقیق)۔ناشر۔اے پی آر آئی۔ٹونک

۹۔ ۱۹۸۷ء۔پہلی آواز۔حصہ دوم(ترتیب و تدوین)مفصل رپورٹ مع مقالات کل راجستھان سیمینار۔منعقدہ مارچ ۱۹۸۶ء،زیر اہتمام راجستھان اردو اکیڈمی،جے پور۔

۱۰۔ تخلیقات۔(ترتیب و تدوین)مفصل رپورٹ مع مقالات کل راجستھان سیمینار منعقدہ مارچ ۱۹۸۷ء۔زیر اہتمام راجستھان اردو اکیڈمی۔بعنوان راجستھان کے ادیب و شاعر۔

۱۱۔ ۱۹۹۲ء۔راجستھان میں اردو زبان و ادب ۱۸۵۷ء تک(تحقیق)

۱۲۔ ۱۹۹۳ء منشی محمد ایوب خاں فضا جے پوری۔مونوگراف۔ناشر۔راجستھان اردو اکیڈمی،جے پور

۱۳۔ ۲۰۰۶ء۔مشرقی راجپوتانہ کے قدیم اردو مراکز:الور بھرت پور اور دھول پور(تحقیق)

۱۴۔ ۲۰۰۷ء۔اردو ترجمہ رباعیات عمر خیام مشمولہ بین اللسانی ترجمہ اردو ہندی سنسکرت۔ناشر پراکرت بھارتی،جے پور

۱۵۔ ۲۰۰۸ء۔دور حاضر میں ٹونک کا ایک نمائندہ محقق و مترجم،ڈاکٹر ریاض الدین

خاں (مونو گراف)

۱۶۔ ۲۰۰۷ء۔راجستھان کی ادبی تاریخ کے چند اردو ماخذ۔ترتیب و تدوین۔بہ اشتراک صاجزادہ عبدالعید خاں۔ناشر اے پی آز آئی ٹونک۔

۱۷۔ ۲۰۱۰ء۔اردو ترجمہ قصہ آب گلشن عشق ترجمہ غلام حیدر عزت (تحقیق)۔ناشر۔ اے پی آر آئی۔

۱۸۔ ۲۰۱۳ء۔سابق ریاست جے پور میں اردو شعروادب کا ارتقا (تحقیق)۔ناشر۔ راجستھان اردو اکیڈمی۔جے پور

۱۹۔ ۲۰۱۴ء۔کہانی تاریخی چبوترے کی۔(تحقیق)۔ناشر۔راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی۔جے پور

ان کے علاوہ مختلف درجات کی نصابی اردو کتب نیز ہمہ گیر خوانہ کی مہم (ٹی ایل سی) ضلع ٹونک کی جانب سے ۱۹۸۴ء میں ٹونک ضلع کے ناخواندہ بچوں کی اردو تعلیم کے لئے مطبوعہ اردو کی درسی کتابوں کے تین حصہ بعنوان آؤ ہم پڑھیں بھی شائع ہو چکے ہیں۔جن کو راقم الحروف کی سربراہی میں متعلقہ کمیٹیوں کے اراکین نے مرتب کیا تھا۔اسی طرح گورمنٹ کالج ٹونک کا سالانہ میگزین بعنوان شت دھارا ۶۴۔۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک مسلسل راقم الحروف کی نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔اس کے علاوہ سہ ماہی نخلستان اودے پور اور سہ ماہی نخلستان جے پور نیز ماہنامہ شفق ٹونک کے مختلف شمارے بھی راقم الحروق کی ادارت میں شائع ہوئے۔

سوال۔۱۷۔آپ کے آئندہ اشاعتی منصوبے کیا ہیں۔

جواب۔میں نے اپنے والد کے کتب خانہ شاغل جے پور کے ادبی ذخیرے میں سے تقریباً تین ہزار سے زائد کتب و رسائل اہل علم اور بالخصوص ریسرچ اسکالرز کے استقادہ کے لئے ٹونک کے اے پی آر آئی میں والد صاحب کے نام سے پیش کر دئے تھے۔جن میں ایک ہزار سے زائد مخطوطات شامل ہیں۔وہ تمام ادبی ذخیرہ شاغل کلکشن کے نام سے

مذکورہ ادارے کی زینت ہے۔اس کے علاوہ کتب خانہ شاغل جے پور کے بقیہ ادبی ذخیرہ میں راقم الحروف بھی اضافہ کرتا رہاہےاور باالخصوص راجستھان کے شعراوادبا کی تخلیقات جو آزادی کے بعد شائع ہوئیں ان کو فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔اس طرح تشکیل راجستھان کے بعد کی مطبوعات کا ایک گراں قدر ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے۔اس میں سے فی الحال جے پور کے شعراوادبا کے استفادہ کے لئے شائع کرانے اور نیٹ ورک پر ڈالنے کی کوشش کرونگا۔اسی طرح جے پور کے علاوہ بھی راجستھان میں شائع ہونے والی اردو کی تمام کتابوں کی فہرست سازی کا ارادہ ہے۔اس کے لئے والد صاحب مرحوم کے نام سے مولانا شاغل اردو ریسرچ سینٹر جے پور قائم کیا ہے۔ جہاں تشکیل راجستھان کے بعد اسی صوبہ کے ارباب علم وادب کی مطبوعہ تخلیقات یکجائی طور پر فراہم کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

سوال ۔۱۸۔مارچ ۲۰۱۶ء میں آپ سے ملاقات کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مشہور شاعر معین احسن جذبی سے آپ کی رشتہ داری تھی۔آپ کی بیٹی جذبی صاحب کے فرزند کے نکاح میں ہیں۔اس تعلق سے جذبی صاحب کی حیات اور شاعری کے بارے میں کچھ بتائیں۔کچھ یادگار واقعات،کوئی ناقابل فراموش بات۔

جواب۔جی ہاں ۔میری بڑی دختر ڈاکٹر سیما عثمانی جذبی صاحب کے صاحبزادے پروفیسر سہیل حسن کی اہلیہ ہیں۔ جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے انگلش ڈپارٹمنٹ کے صدر اور فیکلٹی آف آرٹ کے ڈین کے عہدے سے حال ہی میں سبکدوش ہوئے ہیں جذبی صاحب سے اس رشتہ سے قبل میرا ایک تعلق یہ بھی ہے کہ وہ میرے پی ایچ ڈی کے گائڈ تھے۔اور میں نے ان کی رہبری اور رہنمائی میں اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کر کے ۱۹۷۰ء میں راجستھان یونیورسٹی جے پور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔اس تعلق سے مرحوم کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں مگر طوالت کے مدنظر ان واقعات اور زندگی کے حالات کا بیان کرنا ممکن نہیں۔ جو موصوف وقتاً فوقتاً مجھے سناتے رہے یا جو میری نظر کے سامنے گزرے۔جذبی صاحب کی حیات اور شاعری سے متعلق مشتاق صدف کی کتاب

بعنوان معین احسن جذبی، مطبوعہ ۲۰۰۸ء منسلک ہے۔

مرحوم نہایت مخلص، ہمدرد اور بے لوث انسان تھے۔ چھوٹی عمر میں آغوش مادر سے محروم ہونے کے بعد سوتیلی والدہ کے برتاؤ نے گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور زندگی کی تلخیاں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے بالآخر زندگی کو خوشگوار بنانے میں کامیاب ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد اپنی سوتیلی والدہ کی اس طرح خدمت کی کہ وہ جذبی صاحب کی گرویدہ ہوگئیں۔ جذبی صاحب نے اپنے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ ہمیشہ سگے بھائیوں کی طرح برتاؤ کیا۔ حتیٰ کہ اپنے لکھنؤ کے موروثی مکان کا حصہ بھی ان سے طلب نہیں کیا۔

جذبی صاحب ایک مشفق استاد اور شاگرد نواز تھے۔ اگر ان کی اعانت اور سرپرستی مجھے حاصل نہ ہوتی تو میں راجستھان میں رہتے ہوئے کبھی اردو میں پی ایچ ڈی نہیں کر سکتا تھا۔ پی ایچ ڈی کے لئے رہبری اور رہنمائی سے قطع نظر اس زمانہ میں جب راجستھان میں اردو میں پی ایچ ڈی تو کیا ایم اے کی تعلیم بھی شروع نہیں ہوئی تھی مجھے پی ایچ ڈی کی اجازت کا ملنا اور اس کے بعد ضابطہ کی تکمیل مثلاً گائڈ سے متعلق صدر شعبہ کا سٹیفکیٹ یونیورسٹی کے وی سی کا اجازت نامہ اردو میں مقالہ کی تحریر کی اجازت وغیرہ کے سلسلے میں قدم قدم پر موصوف کا تعاون حاصل رہا۔ اور جب میں نے ان کو اپنا کام دکھانا شروع کیا تو ہمیشہ میری بہت ہمت افزائی فرمائی۔ وہ فرماتے تھے کہ ادب میں یقیناً ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ اور یہ بات خود مجھ سے ہی نہیں بلکہ دوسرے حضرات سے بھی جو ان سے ملنے آتے تھے، موصوف کہا کرتے تھے۔ موصوف میری تحریری کاوشات کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور کہیں کہیں طرز تحریر کی نوک پلک سدھار کر پی ایچ ڈی کے نگراں کا فریضہ ادا کرتے تھے۔

سوال ۔۱۹۔ رشتہ قائم ہونے کے بعد جذبی صاحب کن کن وقتوں میں جے پور یا ٹونک تشریف لائے اور راجستھان کے علمی و ادبی حلقوں نے کس طرح ان کا خیر مقدم کیا۔

جواب۔ جذبی صاحب سے جب رشتہ قائم ہوا تھا اس زمانہ میں موصوف سروس سے رٹائر ہو چکے تھے۔اور علالت اور عمر کے تقاضے کے باعث سفر سے پرہیز کرنے لگے تھے۔حتیٰ کے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت سے بھی معذرت کرنے لگے تھے۔میں نے بارہا کوشش کی کہ موصوف جے پور اور ٹونک تشریف لائیں۔اردو اکادمی جے پور کے مشاعروں اور اے پی آر آئی ٹونک کے سالانہ سیمیناروں میں بارہا موصوف کو مدعو کیا گیا مگر موصوف نے شرکت نہیں فرمائی۔۱۹۷۰ء میں میرے پی ایچ ڈی کے وائے وا کے سلسلے میں جب بحیثیت نگراں آپ جے پور تشریف لائے تھے تو میرے والد صاحب نے موصوف کے اعزاز میں تسلیم منزل پر ایک ادبی تقریب کا انعقاد کیا تھا۔جس میں بالخصوص جے پور کے نمائندہ بزرگ شعرا و ادبا کے علاوہ بہت سے ہمدردان اردو کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

سوال۔۲۰۔میرا خیال ہے کہ راجستھان کے شیخاواٹی علاقہ پر ابھی تک خاطر خواہ تحقیق نہیں ہوئی۔کیا آپ میری بات سے اتفاق رکھتے ہیں۔

جواب۔جی ہاں آپ کا خیال صحیح ہے۔یہی راجستھان کا وہ علاقہ ہے جہاں اٹھارویں صدی میں فرقہ مہدویہ کے بزرگوں نے قدیم اردو زبان میں اپنے عقائد سے متعلق منظوم کتابیں تصنیف کی تھیں۔ان میں سے پروفیسر محمود شیرانی نے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے صرف ان ہی سے متعلق مزید تحقیقی کام کیا گیا ہے۔۔ان کے بعد بھی کتابیں لکھی گئی ہو نگیں۔ایسی صورت میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

شیخاواٹی کے قصبہ جھن جھنوں اور قصبہ فتح پور میں قائم خانیوں کی حکومتیں قائم رہی ہیں۔ان قائم خانیوں میں بہت سے علم دوست،عالم و فاضل حضرات بھی پیدا ہوئے جن کا ذکر قائم خانیوں کی تاریخ میں ملتا ہے۔ان میں سے بہت سے حضرات ریاست حیدر آباد دکن میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ان ہی میں نواب محمد خاں بہادر دلاور جنگ کا نام بھی شامل ہے جنھوں نے میر عباس علی سے راجستھانی بھاشا کے قصہ بعنوان تمامی قصہ پرتھی راج کا،اردو ترجمہ ۱۸۴۴ء میں تحریر کرایا تھا۔جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا

جا چکا ہے۔اس قصہ پر مزید تحقیق کے علاوہ قائم خانی حضرات کی اردو خدمات پر بھی تحقیق کی ضرورت ہے۔اسی طرح فتح پور کے خواجہ نجم الدین کی اردو تصانیف اوران کی فارسی تصانیف کے اردو تراجم با الخصوص فارسی کے شجرۃ المسلمین کے اردو ترجمہ پر تحقیق کی ضرورت ہے۔نیز اسی خاندان کے دوسرے افراد جو فتح پور اور جھن جھنوں کے علاوہ شیخاواٹی کے دیگر قصبات میں بھی سکونت پذیر رہے ان کی ادبی خدمات پر بھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

سوال ۔۲۱۔کیا آپ اپنی ادبی اور خانگی زندگی سے مطمئن ہیں۔

جواب ۔الحمداللہ۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں سے اس طرح نوازا ہے کہ آج رٹائرمنٹ کے بعد بھی میں اپنی ادبی اور خانگی زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں۔اللہ نے مجھے اور میری اہلیہ کو سعادت حج سے نوازا۔اعلیٰ تعلیم کے ساتھ مجھے اپنے بزرگوں کی علمی وادبی وراثت کی پاسداری کی توفیق عطا فرمائی۔سعادت منداولاد سے نوازا۔چار لڑکیاں اور دو لڑکے عطا فرمائے۔سب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔سب کی شادیوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں۔لڑکیوں کو خاطر خواہ بر ملے۔چاروں داماد بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔سب سے بڑے داماد پروفیسر کے عہدے سے رٹائر ہوئے ہیں۔ان کی لڑکی ڈاکٹر ہے اوراپنے انجینیر شوہر کے ساتھ لندن میں سکونت پذیر ہے۔۔ان کا لڑکا انجینیر ہے اور جدہ میں ملازم ہے۔دوسری لڑکی کے شوہر انجینیر ہیں اور کنیڈا میں سکونت پذیر ہیں۔تیسری لڑکی کے شوہر میڈیسن کے پروفیسر ہیں اور امریکہ میں رہتے ہیں۔ان کا لڑکا بوسٹن میں ڈاکٹر ہے۔اور لڑکی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔چوتھی لڑکی کے شوہر بزنس مین ہیں اوراجین ایم پی میں رہتے ہیں۔میرا بڑا لڑکا بمبئی میں ایک بڑی کمپنی کا مینیجنگ ڈائرکٹر ہے۔اور چھوٹا بیٹا جے پور میں اعلیٰ پیمانہ پر اپنا کاروبار کر رہا ہے۔دونوں بھائی میری خدمت اوراطاعت گزاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔اللہ کا شکر ہے دونوں کی بیویاں بھی سعادت مند ہیں۔

خانگی زندگی میں مجھے یہ بھی اطمنان ہے کہ جہاں اپنی موروثی جائداد میں سے شریعت کے مطابق اپنی بہنوں کے حصہ کی رقم ان کو ادا کر دی وہیں اپنی ذاتی جائداد کا تقاسمہ بھی شریعت کے مطابق (لڑکے کا پورا حصہ اور لڑکی کا آدھا حصہ) کر دیا ہے۔ چاروں لڑکیوں کے حصوں کی قیمت ان کو ادا کر دی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میرے سب بچوں اور ان کے بچوں میں باہمی محبت ہے جو میرے لئے باعث اطمنان ہے۔ میں خود گورمنٹ پوسٹ گریجوئیٹ کالج کے پرنسپل کے عہدے سے سبک دوش ہو کر پینشن پا رہا ہوں اور اسی بیاسی سال کی عمر میں بفضلہٖ آج بھی میرا علمی و ادبی مشغلہ جاری ہے۔

سوال۔۲۲۔ جس طرح آپنے اپنے بزرگوں کی علمی و شعری روایات کو آگے بڑھایا ہے کیا آپ کے بعد آپ کے خاندان میں اس روایت کا تحفظ کرنے والا بھی کوئی ہے۔

جواب۔ ہندوستان کی آزادی کے زمانہ تک ہمارے خاندان میں یہ روایت قائم تھی کہ بچوں کو جدید تعلیم سے پہلے علوم شرقیہ بالخصوص فارسی عربی کی تعلیم لازمی طور پر دلوائی جاتی تھی۔ چنانچہ خود میں نے اور میرے دو بڑے بھائیوں نے باقاعدہ طور پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پراوئیٹ طلبا کی حیثیت سے منشی فاضل وغیرہ کے امتحانات دئے تھے۔ اس زمانہ تک ہمارے جدی خاندان کے بیشتر افراد ہمارے آبائی وطن نارنول میں سکونت پذیر تھے آزادی اور تقسیم ہند کے دوران ہمارا نارنول کا پورا خاندان فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہو گیا۔ اسی زمانہ میں میرے سب سے بڑے بھائی جو دہلی میں ملازم تھے دوران سفر ٹرین میں شہید ہو گئے۔ والد صاحب نے وقت سے بہت پہلے ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ ایسے حالات میں جے پور میں میرے جدی خاندان میں صرف میرے والد صاحب کا ایک کنبہ باقی بچا تھا اور اس میں آخری نسل کے ذکور میں صرف میں اور مجھ سے بڑے بھائی تھے۔ جنھوں نے عربی فارسی پڑھی تھی۔ آزادی کے بعد عربی فارسی کی تعلیم کا سلسلے جاری نہیں رہ سکا۔ نئی نسل کے بچوں نے شروع سے ہی جدید تعلیم حاصل کی۔ تاہم میں نے اپنے سب بچوں کو لازمی طور سے اردو بھی پڑھائی اور میرے پوتا پوتی اور نواسا نواسی بھی جدید

تعلیم کے ساتھ اردو بھی پڑھ رہے ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں کی علمی و شعری روایت کو آگے بڑھانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔البتہ ہمارے خاندان کے بقیہ ادبی خزانے کے تحفظ کے قابل میں نے اپنے دونوں لڑکوں کو تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں یہ واضح کرنا ضروری ہے،مذکورہ ادبی خزانے کے تین ہزار سے زائد مطبوعات و مخطوطات بشمول رسائل و جرائد وغیرہ اے پی آر آئی ٹونک میں محفوظ کرادئے ہیں جن کا ذکر پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔بقیہ کتابوں مین اضافہ کے ساتھ جے پور میں مولانا شاغل رسرچ سینٹر کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا ہے اوراس کے تحفظ کا ذمہ دار اپنے دونوں بیٹوں کو بنایا ہے۔

سوال ۔۲۳۔آپ نے راجستھان کے کن کن بزرگوں اور استاد شعرا کو دیکھا ہے اور کن کن سے فیضیاب ہوئے ہیں۔

جواب۔ مجھے راجستھان کے جن بزرگوں اور نامور ادبی شخصیات کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا ہے ان کی فہرست بڑی طویل ہے۔اور یہ سلسلے میرے بچپن کے زمانہ سے آج تک جاری ہے۔ان میں ایسے حضرات بھی شامل ہیں جو ملک کی تقسیم کے زمانہ میں ترک سکونت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔اور ایسے حضرات بھی شامل ہیں جو آزادی کے بعد راجستھان کے مختلف علاقوں میں اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔ان میں وہ بھی شامل ہیں جو تشکیل راجستھان کے بعد دوسرے مقامات سے راجستھان میں آکر سکونت پذیر ہوئے اور وہ بھی جن کی ادبی زندگی کا آغاز ہی تشکیل راجستھان کے بعد ہوا۔یا جو راجستھان کی تشکیل کے بعد اس صوبہ میں پیدا ہوئے تھے۔اور اس کی وجوہات یہ ہیں کہ ہمارے بزرگوں کے زمانہ سے ہمارے آبائی مکان تسلیم منزل پر ماہ محرم کی سالانہ مجالس اعزا اور بزم سلام گوئی کے علاوہ ربیع الاول میں محافل میلاد اور جلسہ مناعتہ کا سلسلہ انیسویں صدی کے آخر زمانہ سے جاری تھا۔ جو ۱۹۷۰ء تک جاری رہا۔اس میں جے پور کے تقریباً تمام شعرا شرکت کرتے تھے۔ان سب کو دیکھنے کا موقع ملا۔

اسی طرح آزادی سے قبل جب میں مدرسہ دارالعلوم اور مدرسہ تعلیم الاسلام میں فارسی اور عربی پڑھتا تھا میرے ہم جماعت اور ہم مکتب ایسے حضرات بھی رہے تھے جن کا شمار بعد میں جے پور کے علما و فضلا میں کیا گیا۔ ایسے حضرات میں مولانا سالک عزیزی تو میرے ہم جماعت بھی رہے تھے جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد سروس کے ابتدائی زمانہ میں انجمن ترقی اردو راجستھان کے زیر اہتمام ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۴ء تک جے پور اور جودھپور میں منعقدہ کل ہند اور کل راجستھان مشاعروں میں اور سیمیناروں میں شرکت کرنے والے راجستھان کے برگزیدہ شعرا و ادبا کو دیکھنے اور ملنے کے مواقع ملتے رہے۔ نیز مختلف مقامات اجمیر، اودے پور، سیکر، اور بالخصوص ٹونک میں پوسٹنگ کے دوران اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرے سیمینار اور کانفرنس وغیرہ منعقد کئے اور خاص طور پر ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۲ء تک راجستھان اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام راجستھان کے مختلف اضلاع میں بحیثیت سکریٹری جو مشاعرے اور سیمینار وغیرہ منعقد کئے ان میں شرکت کرنے والے شعرا و ادبا سے ملاقات کے مواقع ملتے رہے اور اس طرح راجستھان کے مختلف اضلاع کے نامور شاعروں ادیبوں اور بزرگ و برگزیدہ ادبی ہستیوں سے شرف ملاقات حاصل ہوتا رہا۔ اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ان سب کی فہرست تو بہت طویل ہے اگر صرف جے پور کے حضرات کی فہرست بنائی جائے تو وہ بھی کافی طویل ہو گی۔ ان میں بھی آزادی سے قبل کے جو بزرگ شعرا ادبا ترک وطن کر گئے ان میں سے چند بزرگ حضرات کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

مولانا معشوق حسین اطہر۔ مولانا اسماعیل رزی۔ قاضی نور احمد تنویر۔ حافظ یوسف علی عزیز۔ عبدالرحمٰن کوکب۔ انور علی شاد۔ مولانا طٰسین ذہین۔ عبدالوہاب عاصم۔ عبدالسلام خیال۔ عبدالرشید فاضل۔ خورشید علی مہر۔ ساجد علی ساجد۔ عبدالمجید افضل۔ پروفیسر عبدالغنی۔ پروفیسر حامی الدین۔ امیرالدین خاں شوخ۔ پروفیسر طاہر حسین نقوی۔ اوران کے والد مولانا شاکر حسین نقوی۔ مولانا محمد بقا۔ خان بہادر الطاف احمد خیری۔

ترک وطن کرنے والے شعراوادبا کے علاوہ جے پور کے دیگر ارباب شعروادب نیز تشکیل راجستھان کے بعد دوسرے مقامات سے جے پور آکر سکونت کرنے والے حضرات اور وہ حضرات جو تقسیم ملک کے بعد سرزمین جے پور ہی میں پیدا ہوئے۔ان کی فہرست بھی کافی طویل ہے۔ان میں سے کچھ حضرات کے نام یہ ہیں۔

مولانا منظور احمد کوثر۔حافظ محمد ایوب خاں قمر واحدی۔مولانا احترام الدین شاغل۔منشی ایوب خاں فضا۔منشی چاند بہاری لال صبا۔لکشمی نراین سخا۔قاضی امین الدین آثر۔منصور علی خاں بسمل۔منور حسین زیب۔صلاح الدین عشقی۔عبدالحئی فائز۔فدا حسین فدا۔ولی احمد خاں قدسی۔مظہر حسین ناظم۔راہی شہابی۔فرید ایوبی۔نواب مکرم علی خاں مکرم۔پروفیسر حمید اللہ عرشی۔افتخار علی شمیم۔چاند نراین ٹکومہر۔آغا حسین آغا۔آغا حسین یکتا۔کرشن گوپال سخن۔رشید احمد احمر۔محمد بخش منظر۔عبدالرحمٰن پارسا۔شیدا جے پوری۔حسین کوثری۔فہیم الحسن شمیم۔وغیرہ کے علاوہ وہ جو جے پور میں رہنے والے میرے ہم عصر حضرات میں خداداد خاں مونس۔مختارالرحمٰن راہی۔فرحت ایوبی وغیرہ کے علاوہ باہر سے آئے ہوئے تمام شعراوادبا،نئی نسل کے شعراوادبا۔ان سب کے ناموں کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔

سوال نمبر۔۲۴۔کیا ٹونک میں حافظ محمود شیرانی اوران کے فرزند اختر شیرانی کے لئے کوئی یادگار قائم ہوئی۔

جواب۔حافظ محمود شیرانی کی یادگار کے طور پر کوئی باقاعدہ ادارہ تو قائم نہیں ہوا۔نہ ان کے نام سے میڈل یا کوئی یادگار ٹرافی وغیرہ جاری ہوئی البتہ شہر سے ان کی قبر کی جانب جانے والی سڑک کا نام پروفیسر محمود شیرانی روڈ رکھنے کی کوشش کی گئی۔مگر اس کا گزٹ نوٹیفکیشن نہو نے کے باعث یہ کارروائی بھی فائلوں تک محدود ہوکر رہ گئی۔تاہم ۱۹۸۰ء میں ان کے نام پر اے پی آر آئی ٹونک میں ایک روزہ سیمینار، ایک سہ روزہ کل ہند سیمینار منعقد کیا گیا تھا اور ادارہ کے سالانہ مجلّہ کا خصوصی نمبر بھی شائع کیا گیا تھا۔اس کے بعد ان کے نام پر چند

چھوٹے چھوٹے پروگرام ٹونک میں منعقد ہوتے رہے۔اسی طرح اختر شیرانی کے نام سے منسوب شیرانی اکیڈمی قائم کی گئی تھی۔مگر وہ عدم دلچسپی کا شکار ہوکر رہ گئی۔

سوال۔۲۵۔اپنے ہونہار شاگردوں میں چند ایک کے نام بتائیں۔

جواب۔میرے شاگردوں میں صاحب تصنیف ارباب علم وادب بھی شامل ہیں اور درس و تدریس کے علاوہ مختلف سرکاری محکموں کے ملازم اور وکلا بھی۔ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

صاحبزادہ عبدالمعید خاں (سابق ڈائرکٹر اے پی آر آئی ٹونک)

سعید احمد۔آر اے ایس — عقیل احمد۔آر اے ایس

طارق عالم۔آر اے ایس — ڈاکٹر عمر جہاں۔

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی — ڈاکٹر معقول ندیم

اقبال خاں — ڈاکٹر ریاض الدین انصاری

سید ساجد علی ٹونکی

ان کے علاوہ کالجوں میں اردو کے صدر شعبہ، یونیورسٹیوں اور ہائر سیکنڈری اسکولوں میں مختلف مضامین کے اساتذہ، ہیڈ ماسٹر، ایس ڈی آئی، پی ٹی آئی، لائبریرین، اور وکلا کی ایک بڑی تعداد ہے۔جن میں سے بعض حضرات کی تصانیف وتالیفات شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔

سوال۔۲۶۔راجستھان سے دور رہ کر اردو زبان وادب کے لئے کام کرنے والوں سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب۔یہ سوال آپنے غالبًا ان حضرات سے متعلق کیا ہے جن کا تعلق راجستھان سے ہے۔ایسے چند حضرات ہندوستان کے علاوہ خلیجی ممالک یو اے ای، سعودی عرب، کویت، مسقط، وغیرہ میں بھی ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں اور مغربی ممالک امریکہ، انگلینڈ، کنیڈا، جرمنی وغیرہ میں بھی جہاں وہ حضرات ادبی انجمنوں سے بھی وابستہ

ہیں۔اردو کے رسائل و جرائد میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔اور کتابی صو
رت میں بھی ان کی تصنیفات شائع ہوکر منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔ان سے قطع نظر
راجستھان کے چند ادیب اور شاعر اپنی سرزمین سے دور ملک کے مختلف صوبوں میں رہ کر
اپنے ذوق ادب کی تکمیل کے ساتھ اردو زبان و ادب کے لئے کام کررہے ہیں۔اگر چہ
میں ذاتی طور پر ایسے تمام حضرات سے واقف نہیں تاہم میں جن ادبی شخصیتوں کو ذاتی طور
پر جانتا ہوں ان میں خداداد مونس آجکل ہریانہ میں سکونت پذیر ہیں۔ان کی منظوم و منثور
تخلیقات شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔اسی طرح سید ساجد علی ٹونکی پوسٹل ڈپارٹمنٹ
میں ملازم ہیں اور اور دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔ان کی مختلف موضوعات پر نثری تصانیف
شائع ہوچکی ہیں۔اور بالخصوص نذیر فتح پوری جو عرصہ دراز سے مہاراشٹر کے شہر پونہ میں رہ
کر اردو زبان و ادب کی ترویج اشاعت کے لئے پرخلوص کام کررہے ہیں۔موصوف خود
تخلیق کار ہیں اور تخلیقی ادب کی قدر کرتے ہیں۔اپنی ذاتی تصانیف و تالیفات (جن کی
تعداد ۳۷ ہے) کے علاوہ دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی درجنوں کتابیں شائع کر چکے
ہیں۔تقریباً پینتیس سال سے موصوف کی ادارت میں ماہنامہ اسباق مسلسل شائع ہورہا
ہے۔جو بجائے خود اردو کے رسائل و جرائد میں ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔اس لئے
کہ اردو کے سرکاری یا صوبائی اکادمیوں کے جرائد سے قطع نظر نجی طور پر کسی جریدے کا
اتنے طویل عرصہ تک مسلسل جاری رہنا اہمیت رکھتا ہے۔آپ نے کسی یونیورسٹی یا کالج میں
تعلیم حاصل نہیں کی ہے بلکہ اپنی مکتبی تعلیم کی بنیاد پر اپنے ذوق ادب کو پروان چڑھایا اور
اپنے مطالعہ سے اپنی شعری و ادبی صلاحیتوں میں ایسی جلا پیدا کی کہ اہل تحقیق نے آپ
شعری و ادبی خدمات اور منظوم و منثور تخلیقات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔اور تحقیقی مقالات
مرتب کرکے مختلف یونیورسٹیوں سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔اور
آپ کی شعری و ادبی خدمات پر مشتمل مختلف کتابیں مرتب کرکے شائع کیں۔نیز آپ کی
ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف ریاستی اکادمیوں اور ہندی کی درجنوں ادبی انجمنوں

کمیٹیوں اور سوسائیٹیوں نے ملک گیر سطح پر آپ کو اعزازات وانعامات کے ساتھ مختلف ادبی خطابات سے نوازا جنکی فہرست کافی طویل ہے۔اور یہ سلسلہ ابتک بدستور جاری ہے۔

سوال۔۲۷۔فتح پور شیخاواٹی کے بزرگ خواجہ نجم الدین چشتیؒ کی تمام کتابوں کی فہرست آپ کے پاس ہے ان کے نام بتائیں۔

جواب۔خواجہ نجم الدین نجم المعروف پروانہ، فارسی اردو اور ہندی کے صاحب تصنیف عالم وفاضل اور باکمال شاعر تھے۔آپ کا شمار راجستھان میں پیدا ہونے والے اردو کے شعراو ادبا کی صف اول میں ہوتا ہے۔آپ کی فارسی اردو اور ہندی (اردو رسم الخط) میں منثور و منظوم تصانیف وتالیفات کی فہرست کافی طویل ہے۔ان میں سے حسب ذیل تصانیف و تالیفات کے نام مجھے معلوم ہیں۔

فارسی تصانیف۔

۱۔مناقب الحبیب (احوال وملفوظات خواجہ معین الدین چشتیؒ)

۲۔مناقب التارکین (حالات وملفوظات سلطان التارکین صوفی حمید الدین ناگوریؒ)

۳۔مناقب المحبوبین (رسول مقبولؐ سے خواجہ فخر الدین دہلویؒ تک مشائخ وصوفیائے چشتی کے مختصر ذکر کے ساتھ خواجہ نور محمد مہارویؒ اور خواجہ سلیمان تونسویؒ کے تفصیلی حالات)

۴۔راحت العاشقین ۵۔مقصود العارفین ۶۔شجرۃ العارفین

۷۔شجرۃ المسلمین (شجرہ وحالات نوابین فتح پور وجھن جھنوں وشیخاواٹی) اس کتاب کا اردو ترجمہ خواجہ صاحب کے فرزند مولانا شاہ محمد رمضان نے ۱۸۸۴ء میں کیا تھا۔اور اس کی نقل وارث علی شاہ ساکن جھن جھنوں نے ۹ رجنوری ۱۹۰۶ء کو تحریر کی تھی۔)

۸۔شجرۃ الابرار ۹۔تذکرۃ السلاطین (حالات سلاطین ہند)

۱۰۔نجم الواعظین۔ ۱۱۔احسن القصص

۱۲۔احسن العقائد ۱۳۔نجم الہدایت

۱۴۔ہدایت نامہ ۱۵۔خیالات نجمی

۱۶۔ دیوان نجم ۱۷۔ گلزار وحدت

(حمد یہ قصیدہ۔ اس قصیدہ کی اردو شرح وحدۃ الوجود کے نام سے خواجہ صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد رمضان صاحب نے ۱۸۵۶ء میں لکھی تھی۔ جو مکتبہ رضویہ دہلی میں چھپ چکی ہے)

اردو تصانیف

۱۸۔ بیان الاولیا (حالات وملفوظات بزرگان چشت) ۱۹۔ تذکرۃ الواصلین

۲۰۔ حیات العاشقین (سوانح بزرگان دین۔ دو حصہ) ۲۱۔ دیوان نجم اردو

۲۲۔ سماع السامعین (مسئلہ سماع) ۲۳۔ باجی الغیرت (علم توحید)

۲۴۔ نجم الآخرہ (مسائل شریعہ) ۲۵۔ افضل الطاعت

۲۶۔ فضیلۃ النکاح ۲۷۔ پیر ملانی غیر بھلانی

(اس منظوم کتاب میں ہندی آمیز زبان استعمال کی گئی ہے)

۲۸۔ بارہ ماہیہ نجم ۲۹۔ پریم گنج

(ہندی آمیز زبان میں دوہوں کا مجموعہ)

مذکورہ کتابیں موضوع کے اعتبار سے مسائل شریعہ، فقہ، تصوف، توحید، روحانیت، سیرت، سوانح، تاریخ ادب وغیرہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان میں چند کتابوں کے ترجمے شائع بھی ہو چکے ہیں۔ خواجہ صاحب کی تصانیف پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ آپ نے اپنی تصانیف میں عام طور پر ان کتابوں کے حوالے بھی دئے ہیں جن سے سوانح سیرت اور تاریخی کتابوں کی تصنیف وتالیف سے آپ نے استفادہ کیا ہے۔

سوال۔ ۲۸۔ خواجہ صاحب کی تصنیف شجرۃ المسلمین، جس کا فارسی سے اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ کیا یہ قائم راسا سے ماخوذ ہے۔

جواب۔ شجرۃ المسلمین خواجہ نجم صاحب کی فارسی زبان میں لکھی ہوئی ایک ضخیم تاریخی تصنیف ہے۔ جس کا اردو ترجمہ ان کے صاحبزادے مولانا شاہ محمد رمضان نے ۱۸۸۴ء

میں کیا تھا۔ یہ کتاب مختلف فصول پر منقسم ہے۔ ابتدائی تین فصلوں میں حضرت آدم سے سلطان فیروز شاہ کے زمانہ تک فارسی کی مختلف سیر و تواریخ کی کتب مثلاً بحر الانساب، روضۃ صفا، نفائس العیون، معارج النبوۃ، تاریخ طبری، طبقات ناصری، تاریخ فرشتہ، وغیرہ کے حوالوں کے ساتھ مختلف خاندانی شجروں کا ذکر کیا ہے۔ نیز راجگان ہند کے مختلف خاندانوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جن میں قائم خاں کے اسلاف بھی شامل ہیں۔ قائم خاں کے اسلاف کے ذکر سے قائم راسا کا حوالہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔

فصل چہارم سے کتاب کے آخر تک قصبہ فتح پور اور قصبہ جھن جھنوں کے قائم خانی نوابین کا ذکر ہے۔ اور اس میں جا بجا قائم خاں راسا کے حوالے شامل ہیں۔ اس کتاب میں موقع و محل کے مطابق جا بجا سلاطین وقت کے تاریخی واقعات بھی درج ہیں کتاب کے آخری حصہ میں تاریخی کتب کے حوالے کم سے کم تر ہوتے گئے اور مجھے اس کا جو ترجمہ دستیاب ہوا ہے وہ نامکمل ہے۔ اس میں درمیان کے بہت سے اوراق شامل نہیں ہیں۔ اصل ترجمہ ۳۶۴ صفحات پر مشتمل ہے جس کا پتہ ترجمہ پر درج صفحات نمبر سے چلتا ہے۔ جب کہ زیر نظر نامکمل فوٹو کاپی میں ۱۲۱ صفحات ہی ہیں۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شجرۃ المسلمین کے اردو ترجمہ کی نقل پر ۱۳/ ذی قعد ۱۳۴۲ھ مطابق ۹/ جنوری ۱۹۰۶ء کی تاریخ درج ہے جب کہ ۱۹۰۶ء کو ہجری سنہ ۱۳۲۴ھ ہونا چاہیے۔ غالباً ۱۳۲۴ کو سہواً ۱۳۴۲ھ لکھ دیا ہے۔

خداداد خاں مونس

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مرحوم بسمل نقش بندی کی دعوت پر ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے میرا بانسواڑہ جانا ہوا تھا۔ فتح پور سے شبیر فراز اور اودے پور سے شاہد پٹھان بھی شریک مشاعرہ تھے۔ واپسی پر طے پایا کہ تینوں مل کر پہلے اجمیر شریف اور اس کے بعد جے پور جائیں گے۔ اجمیر گئے تو خداداد خاں مونس کے دولت کدے پر بھی حاضر ہوئے۔ مونس صاحب بہت محبت سے ملے۔ مجھ سے ادبی طور پر واقف تھے۔ اس لئے تعارف کی نوبت نہیں آئی۔ ان کے بنگلے کا نام الفھا ہے جو جے پور روڈ پر واقع ہے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ ایسے لوگوں سے مل کر اور باتیں کر کے مجھے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے، جو ادبی طور پر راجستھانی ماحول میں جیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے راجستھان کا ماضی انھوں نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ شعر وادب کے حوالے سے بزرگان دین اور صوفیا کرام کے حوالے سے اور موجودہ ادبی صورت کے حوالے سے مونس صاحب نے اہم گفتگو کی اور ہماری مہمان نوازی کا پورا حق ادا کیا۔

ایک بار انھوں نے اپنے فرزند کی شادی کے موقع پر سہرا لکھنے کی دعوت دی۔ مجھے خوشی ہوئی۔ پہلی فرصت میں مکمل سہرا لکھ کر ڈاک سے ارسال کر دیا۔ جیسے ہی میری ڈاک ان کو موصول ہوئی۔ فون کر کے انھوں نے نہ صرف رسید دی بلکہ میرا لکھا ہوا سہرا مجھے پڑھ کر سنایا اور ایک ایک شعر پر داد سے نوازا۔ مجھے دلی مسرت ہوئی۔ راجستھان کے ایک بزرگ ادیب، شاعر اور تاریخ گو شخص کی جانب سے میری پذیرائی کا یہ نیا انداز تھا۔ میری طرح پر خود بھی دو تین شعر کہہ کر اسی وقت مجھے سنائے۔ وہ بھی ایک طرح سے میرے لئے داد ہی کے مترادف تھے۔

کچھ دنوں کے بعد شادی کے لئے لکھے گئے سہروں اور تہنیتی نظموں کا انتخاب شائع ہوا تو اس کی ایک کاپی مجھے ارسال کی۔ مونس صاحب ادب میں کئی حیثیتوں سے اپنا اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کو وہ داغ کی شعری روایت کے پاسدار ہیں۔ یہ صاف ستھری اور بااثر زبان اب بہت کم نظر آتی ہے۔

اک ستم ڈھانے کا خوگر ایک غم سہنے پہ خوش
یہ بھی کہلاتا ہے دل اور وہ بھی کہلاتا ہے دل

اور یہ سوالیہ نشان؟ جو تصوف کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔

کیسے کیسے بزرگ بیٹھے ہیں
آج کیا ہے شراب خانہ میں

سلام اور مناقب کے میدان میں بھی آپ کی انفرادی سوچ قابل تحسین ہے۔ اور بخشش کی راہ ہموار کرتی ہے۔ پابند اور موضوعاتی نظموں کا اب رواج نہیں لیکن مونس صاحب کی روایت پسند طبیعت نے اس میدان کو بھی کامیابی کے ساتھ سر کیا۔ ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے 'زبان خلق میں' عنوان سے مونس صاحب کے فکر و فن پر تحریر کردہ مضامین مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کئے ہیں۔ جو مونس شناسی کے لئے معتبر حوالہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے منتخب کردہ سوالوں کا آپ نے خوش اسلوبی کے ساتھ جواب تحریر فرمایا ہے۔ اور بہت سے پوشیدہ نکات کو ظاہر کیا ہے۔

نذیر فتح پوری

۲۶/جولائی۔۲۰۱۶ء

طوطئ خواجہؒ خداداد خاں مونس سے گفتگو

سوال ۔ ا ۔ اپنی پیدائش، خاندان اور تعلیم کے تعلق سے مفصل کوائف فراہم کریں۔
جواب ۔ میری پیدائش جے پور میں ۴ر دسمبر ۱۹۳۸ء مطابق ۱۲ر شوال، ۱۳۵۷ھ کو ہوئی۔ والد منشی محمد ایوب خاں صاحب فضاؔ جے پور کے سر بر دہ آور وکلاء میں شمار ہوتے تھے۔ شاعری میں وہ اپنے وقت کے استاد فن تھے۔ اور سلسلہ غالب سے صرف ایک واسطہ سے جڑے ہوئے تھے۔ دادا کا وطن فرخ آباد تھا جہاں آبا و اجداد افغانستان سے آ کر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ دادا جنگ آزادی کے مجاہد تھے۔ انگریزوں سے لوہا لیتے ہوئے ان کے سینے پر جو زخم لگا تھا اس کا نشان قبر تک ساتھ گیا۔ اصل نام محمد انتخاب خاں تھا لیکن جب ان کی پھانسی کا حکم ہو گیا تو وہ روپوش ہو گئے۔ کئی بار نام بدلا اور مہاراجہ الور کے یہاں پناہ لی۔ وہاں بھی خطرہ لاحق ہوا تو خود مہاراجہ نے ہی جے پور بھجوا دیا۔ مہاراجہ جے پور نے در پردہ ایسے لوگوں حفاظت اور سرپرستی کی۔ دادا بھی یہیں کے ہو رہے اور کالوں کی فوج سے اظہار عقیدت کی بنا پر اپنا نام کالے خاں رکھ لیا۔ والدہ کبریٰ فضا جلال آباد یوپی کی رہنے والی تھیں۔ نانا منشی محمد حسین خاں محکمہ آبپاشی میں صدر امین تھے۔ مہاتما گاندھی کی آواز پر انھوں نے بھی انگریزی کپڑوں اور دیگر سامان کی ہولی جلائی اور کھدر پوشی اختیار کی۔ جو مرتے دم تک جاری رہی۔ پر نانا منشی یوسف حسین خاں کو غدر میں بہت سی انگریز عورتوں کی جان بچانے پر وکٹوریہ کراس دیا گیا تھا۔ میری والدہ اور دادی اردو زبان اور تہذیب کا مرقع تھیں۔

میں نے انٹرمی جنیٹ تک جے پور کے مہاراجہ مڈل اسکول، مہاراجہ ہائی اسکول اور مہاراجہ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی ایس سی کیا۔ اور وہیں سے اسٹیٹسٹک کا ڈپلوما کیا۔ پوری یونیورسٹی میں چھوتھی پوزیشن حاصل کی علی گڑھ کے نصاب کے مطابق

سائنس کے ساتھ اردو بھی اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھی اور پروفیسر آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی، نسیم قریشی، ظہیر احمد علوی جیسے اساتذہ سے بے حد قربت حاصل کی۔علی گڑھ سے آکر راجستھان یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا۔بعد میں گورمنٹ آف انڈیا کی اسکالرشپ پر ایک سال کے لئے کرسچین میڈیکل کالج، ویلور (تمل ناڈو) میں میڈیکل ریکارڈ آفیسر کا کورس مکمل کیا اور ۹۸.۹۰ فی صد نمبر حاصل کر کے ایک رکارڈ قائم کیا جس کے سبب کالج میں میرے نام کی سنگ مرمر کی تختی لگائی گئی۔

سوال۔۲۔اپنے اسکول کالج کے ان اساتذہ اور دوستوں کے بارے میں بتائیں جن سے آپ متاثر ہوئے یا جن کے حسن سلوک سے آپ حوصلہ ملا۔یا جن کے غلط رویہ سے آپ کو نقصان پہنچا۔

جواب۔مڈل اسکول میں مولوی ظفر حسین، ہائی اسکول میں مولوی کلیم اللہ، علی گڑھ کے حاجی احسان الحق، پروفیسر آل احمد سرور، رشید احمد صدیقی، نسیم قریشی، ظہیر احمد علوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی (صدر شعبہ دینیات)۔یہ وہ اساتذہ ہیں جنھوں نے نصابی تعلیم کے علاوہ اس علم سے نوازا جواب ناپید ہے۔اس ضمن میں ڈاکٹر عشرت انور کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جو گدڑی شاہی سلسلہ کے مشہور عالم اور ڈاکٹر ظہورالحسن شارب (مقیم اجمیر) کے حقیقی برادر اور سلسلہ مناقب کے سبب میرے والد کے بے حد قدر شناس تھے۔ایک بزرگ تمنا بجنوری مرحوم کی صحبت سے بھی علی گڑھ میں بے حد فیض پہنچا۔وہ اردو اور فارسی کے تجر عالم اور شاعر تھے۔فن تاریخ گوئی کا شوق مجھے اپنے والد کے بعد ان ہی کی صحبت سے رہا۔تاریخ گوئی پر میں نے اپنی تصنیف 'مشکوٰۃ التاریخ' بھی اپنے والد اور تمنا مرحوم کو ہی معنون کی ہے۔یہی سب میرے دوست میرے مربی اور میرے شفیق تھے۔ان حضرات کے علاوہ اشفاق رسول جو ہر مرحوم کے بڑے صاحبزادے انوار الہدیٰ صاحب ایڈووکیٹ تھے۔اور میں ان کا ساتھ نبھانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔میں جب تیسری جماعت میں پڑھتا تھا تب ایک دوست ملا تھا۔مونس اختر نام تھا۔ترپولیہ بازار کے ودیا دھر جی کے

راستہ میں نوامتاز الدولہ مکرم علی خاں صاحب کی حویلی میں رہتا تھا۔شاید نواب صاحب سے رشتہ داری بھی تھی۔ جب ہم چوتھی جماعت میں آئے تو عید پر میں نے اسے اوراس نے مجھے چھوٹے چھوٹے عید کارڈ اپنے دستخط کر کے دے دئے تھے۔ جب پانچویں جماعت میں پہنچے تو ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے دنیا ہی بدل دی۔ مونس کا خاندان بھی ہجرت کر گیا اور پھر کچھ پتہ نہ چلا۔جب میں علی گڑھ میں پڑھتا تھا تو ایک ہم جماعت کے جو میرے روم پارٹنر تھے کے کوئی عزیز پاکستان سے آئے اوران سے ملنے علی گڑھ آئے۔ باتوں باتوں میں ذکر جے پور کا نکل آیا۔تو انھوں نے فرمایا کہ جے پور کے ایک صاحبزادے مونس اختر ہمارے پڑوسی ہیں اور جے پور کو اکثر یاد کرتے ہیں۔میں نے ان سے پتہ لیکر مونس کو خط لکھا۔اورنشانی کے طور پر دس گیارہ سال قبل اس کا دیا ہوا عید کارڈ بھی اسے بھیجا جو میرے پاس محفوظ تھا۔مونس نے فوراً جواب دیا۔تحریر سے لگ رہا تھا کہ شاید خوشی سے پاگل ہو گیا ہے۔میرا عید کارڈ دوبارہ دستخط کر کے مجھے بھیجا۔اور ہزار پریشانیوں کو منھ چڑا کر مجھ سے ملنے آیا۔سمجھ لیجئے خوشی کا کیا عالم ہوگا۔وہ شاید دنیا میں سب سے زیادہ مجھے ہی چاہتا ہے۔اس نے اپنے مکان کا نام خداداد منزل رکھا ہے اور میں نے جس روز تجدید ملاقات ہوئی اپنا تخلص مونس رکھ لیا۔ورنہ اس سے قبل طبیعت کہیں ٹھہرتی نہ تھی۔کبھی یگانہ اور کبھی میکش تخلص استعمال کیا۔

غلط رویہ تو بہت لوگوں کا رہا مگر وہ جن سے نقصان پہنچا ایک ہی تھے۔جو علی گڑھ یونیورسٹی میں فیکلٹی آف آرٹس میں استاد تھے۔میں نے ایم ایس سی جیالوجی کے لئے داخلہ فارم پُر کر کے انھیں بھیج دیا کہ خود جا کر آفس میں جمع کرائیں۔میرٹ پر میرا داخلہ یقینی تھا۔مگر وہ اپنے کسی عزیز میں دلچسپی رکھتے تھے۔مجھ سے جھوٹ بولتے رہے اور جب لسٹ نکلی تو میرا نام نہیں تھا۔خود دوڑا تو معلوم ہوا فارم داخل ہی نہیں کیا گیا تھا۔میں نے راجستھان یونیورسٹی میں ایل ایل بی میں داخلہ تو لے لیا مگر اس واقعہ کو آج تک بھلا نہیں پایا ہوں۔

سوال۔۳۔آپ ادب اور تخلیقی ادب کی طرف کس طرح آئے اور آپ کو کس طرح محسوس

ہوا کہ آپ کاروبار قرطاس وقلم کے میدان کے شہسوار بن سکتے ہیں۔

جواب۔ مجھے کاروبار قرطاس یا اس میدان میں شہسوار بننے کا خیال تو آج تک نہیں آیا البتہ ادب میری گھٹی میں پڑا تھا۔ میں روتا تھا اور میری والدہ مجھے لوری کی جگہ شوق اور نسیم کی مثنوی سناتی تھیں۔ میری دادی جب بہلاتی تھیں ایسے ٹکسالی جملے ان کی زبان سے نکلتے تھے کہ سننے والے بند سمجھا کرتے تھے۔ جب ذرا بڑا ہوا تو والد کی گود میں بیٹھا ان کے شعر سنا کرتا تھا۔ جو ہمارے گھر ہونے والی ہفتہ وار نشستوں میں سنائے جاتے تھے۔ بس تبھی سے رواں رواں کرنے اور قلم چلانے کا چسکہ لگ گیا۔

سوال ۔۴۔ آپ نے سب سے پہلے کیا لکھا، کس سنہ میں لکھا، کہاں چھپا اور اپنی پہلی تخلیق کی اشاعت کے بعد آپ نے کیا محسوس کیا۔

جواب۔ میں جب بہت چھوٹا تھا اور شاید ساتویں جماعت میں تھا تو میری خالہ فیروز پور اپنے بھائی سے ملنے گئی تھیں۔ میں انھیں اسٹیشن چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں سے لوٹ کر میں نے خالہ جان کے نام ایک نظم لکھی تھی جو میری اولین کاوش تھی۔ دو شعر سن لیجیے۔

مری پیاری سی خالہ مری خالہ جان
مبارک قدم اور مبارک نشان
تمہیں لے گئی ریل جے پور سے
میں تکتا کا تکتا ہی رہا دور سے

پہلی تخلیق جس کی اشاعت ہوئی وہ ۵۵۔۱۹۵۴ء کی بات ہے مہاراجہ کالج میگزین میں میری نظم مہاتما گاندھی شائع ہوئی۔ ع

کون ہے وہ ہمیں آزاد کرایا جس نے
شمع آزادی کا پروانہ بنایا جس نے

جس وقت میگزین گھر لایا اور والد کو پیش کیا تو انھوں نے نظم پڑھی۔ پدرانہ شفقت چہرے سے ٹپک رہی تھی مگر پیشوری آڑے آرہی تھی ایک جملہ اس طرف سے آیا یہ

کیا حرکت ہے۔ میرے لئے یہی جملہ ہمہ تحسین تھا۔

سوال۔۵۔آپ کے والد محترم بھی شاعر تھے۔کیا آپ کی کسی تخلیق پر آپ کے والد محترم نے کبھی اصلاحی نگاہ ڈالی یا آپ نے اپنی کسی تخلیق پر ان سے مشورہ لیا۔

جواب۔جب جب ممکن ہوتا تھا میں اپنی تخلیقات والد کو سناتا تھا اور وہ تنقیدی نظر ان پر ڈالتے تھے۔عروض کی باریکیاں اور صنائع بدائع پر وہ بے حد زور دیتے تھے۔بقول ان کے اگر یہ ہی نہیں تو شعر گوئی چہ ضرور۔

سوال۔۶۔آپ کے بزرگوں میں سب سے پہلے کس نے ادب کی آبیاری کے لئے قدم اٹھایا اور قلم سنبھالا،انھوں نے کیا لکھا۔

جواب۔منشی عبد الحمید اخگر میرے ددھیالی عزیزوں میں تھے۔جو عمر میں والد سے بڑے تھے۔ان کا دیوان غیر مطبوعہ ایک امانت کی طرح مجھ تک پہنچا۔میں نے ان کے حالاتِ زندگی جمع کئے۔خوشی ہے کہ یہ دیوان ۱۹۹۲ء میں راجستھان اردو اکیڈمی، جے پور سے شائع ہوا۔

سوال۔۷۔آپ کے بعد آپ کی اولاد میں سے کوئی ایسی شخصیت ہے جو آپ کے تخلیقی اور ادبی سلسلے کو آگے بڑھائے گی اور آپ کی جانشینی کا حق ادا کرے گی۔

جواب۔بحمد اللہ۔میری بڑی بیٹی ڈاکٹر زیبا فضا نے اس ادبی سلسلے کو آگے بڑھانا شروع کر دیا ہے۔خوشی ہے کہ وہ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی میں بھی لکھ رہی ہیں۔مشاعروں،رسالوں اور ٹی وی پروگرام میں ان کی شرکت میرے لئے باعث مسرت ہے۔

سوال۔۸۔آپ کو طوطئ خواجہ کا لقب کہاں سے ملا۔یہ لقب آپ کی شخصیت کے لئے مناسب ہی نہیں بلکہ آپ اس کے حقدار ہیں۔یہ لقب کس ادارے یا کس انجمن کی جانب سے دیا گیا۔

جواب۔طوطئ خواجہ کا خطاب ۴؍رجب المرجب ۱۴۲۱ھ مطابق ۳؍اکتوبر ۲۰۰۰ء کو بین

الممالک ادارے غریب نواز فاؤنڈیشن اجمیر کی جانب سے اس کے صدر نے درگاہ معلےٰ میں منعقدہ کل ہند سیمینار میں عطا کیا گیا۔اس سند افتخار کا عکس ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کی مرتبہ کتاب 'حداداد مونس۔زبان خلق میں' کے صفحہ نمبر ۲۰۵ پر شائع کیا گیا ہے۔

سوال۔۹۔بات جب سلطان الہند کے حوالہ سے شروع ہو چکی ہے تو بتایئے کہ خواجہ صاحب سے آپ کی نسبت کس حوالہ سے ہے۔

جواب۔خواجہ صاحب سے میری نسبت پیدائشی ہے۔پیدائشی نام پر میں آج بھی فخر کرتا ہوں کہ یہ عطائے غریب نواز ہے۔محمد خداداد خاں میرا تاریخی نام ہے۔جس کی بشارت حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے آستانہ پر حاضری کے بعد میرے والد کو بہ عالم خواب حسب ذیل قطعہ کی صورت میں ہوئی۔

توکل پہ رہ چین سے کام رکھ
یہ فرزند فرخندہ فرجام رکھ
خدا نے محمد کا صدقہ دیا
محمد خدا داد خاں نام رکھ (۱۳۵۷ھ)

سوال۔۱۰۔ہمارے بزرگوں نے گزشتہ سو سال میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ تخلیقی فرائض انجام دئے ہیں۔اس کے باوجود کچھ لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے شعر گوئی بھی کی ہے اور ان کا دیوان بھی ہے۔کچھ کا کہنا ہے کہ خواجہ صاحب نے شعر نہیں کہا۔حضرت امام حسین سے منسوب ایک قطعہ اکثر قوال خواجہ صاحب سے منسوب کر کے سناتے ہیں،جس کے مصرعے اس وقت ذہن میں نہیں آرہے،آپ قارئین کے لئے وہ قطعہ بھی فرمائیں اور اس کی حقیقت پر روشنی بھی ڈالیں۔

جواب۔خواجہ صاحب کی شعر گوئی اور ان کے دیوان کی بابت محققین میں کافی اختلاف رہا ہے۔اولاً بہت سے مخطوطات کی بنا پر اسے خواجہ صاحب کا ہی دیوان مانا گیا ہے۔اس فہرست میں آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری مخطوطہ نمبر

۳۷۵۷، آصفیہ لائبریری حیدر آباد، خدا بخش لائبریری پٹنہ مخطوطہ نمبر ۱ ۳۵ و مخطوطہ نمبر ۲۹۹۴ اور پھر جمادی الاول ۱۲۸۸ھ مطابق اگست ۱۸۷۱ء کا شائع کردہ مخطوطہ قابل ذکر ہیں۔ جن پر استدلال بھی کیا گیا ہے۔ بعد میں بیسوی صدی میں محمود شیرانی اور کچھ دیگر محققین نے اس سے اختلاف کیا۔ اور اسے کسی دوسرے شاعر معین ہروی کا دیوان بتایا۔ مگر اب شمس بریلوی، ڈاکٹر عمران، رضا زیدی اور دیگر محققین کی تحقیق اور دلائل سے قریب قریب یہ تسلیم کرلیا گیا ہیکہ مذکورہ دیوان حضرت خواجہ کا ہی ہے۔ ویسے بھی معین ہروی کا زمانہ تو خواجہ صاحب سے دوسو برس بعد کا ہے۔ اس وقت تک تو مذکورہ دیوان پردہ خفا میں رہنا بعید از قیاس ہے۔ حضرت امام حسین سے منسوب آپ جس قطعہ کا ذکر کر رہے ہیں وہ اصل میں حسب ذیل رباعی ہے۔

شاہست حسین بادشاہست حسین
دین است حسین دین پناہست حسین
سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ ست حسین

ایسے اشعار ایک صوفی صافی ہی کہہ سکتا ہے جسے ہر شے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ سودا نے کیا خوب کہا ہے۔

سودا نگاہ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرے میں ہے آفتاب کا

ایک اور رباعی بھی سن لیجئے۔

کارے کہ حسین اختیارے کر دی
در گلشن مصطفٰے بہارے کر دی
از ہیچ پیمبران نیاید ایں کار
واللہ اے حسین کارے کر دی

مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ 'ترجمہ دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ' از خدا داد خاں مونسؔ مطبوعہ، مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک۔ ۲۰۱۱ء۔

سوال۔ ۱۱۔ ہمارے یہاں راجستھان میں آزادی ہند کے بعد تخلیقی میدان میں بہت اہم پیش رفت رہی لیکن تحقیقی میدان میں بھی بڑی جانفشانی کے ساتھ یاروں نے کامیابی کے علم بلند کئے۔ آپ ان محققین سے ہمیں اپنے جواب کے ذریعہ ملوائیں جن کے تحقیقی کار ناموں پر آپ صاد کرتے ہیں اور اطمنان کا اظہار کرتے ہیں۔

جواب۔ تحقیق عمل جاریہ ہے۔ حرف آخر نہیں۔ البتہ اس ضمن میں کوشش اور کاوش ہی کو سراہا جاسکتا ہے۔ تحقیق کے لئے خلوص اور فراخ دلی کی ضرورت ہے۔ راجستھان میں جو بچے اردو زبان و ادب پر تحقیق کر رہے ہیں ان کا نصب العین پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنا ہے جس سے روٹی روزی آرام سے مل جائے۔ آپ انہیں محققین کے زمرے میں شامل کرنا چاہیں تو کرلیں تحقیق تو تلاش و جستجو کے جذبہ کا نام ہے۔ اگر کوئی صاحب جے پور میں بیٹھ کر ہی کسی موضوع یا شخصیت پر تحقیق کر سکتے ہیں تو انھیں کیا پڑی ہے کہ وہ سیکر، چورو یا جھن جھنوں جائیں۔ جنھوں نے پیش رفت کی ان میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، پرفیسر فیروز احمد ،نذیر فتح پوری، اور صاحبزادہ شوکت علی خاں کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ مولانا شاغل ان سے پہلے کے ہیں۔

سوال۔ ۱۲۔ میں نے اس سے پہلے بھی چند احباب سے سوال کیا تھا۔ آپ سے بھی جواب کا طالب ہوں۔ راجستھان سے متعلق کام کرتے وقت ہمارے فاضل محققین شیخاواٹی کے تین اضلاع پر کم توجہ دیتے ہیں۔ مثلاً سیکر، چورو اور جھن جھنوں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

جواب۔ جواب اوپر، گیارہ نمبر میں آ گیا ہے۔

سوال ۱۳۔ آزادئی ہند سے قبل جن محققین نے راجستھان کے حوالے سے اہم کارنامے انجام دئے ہیں ان کا ذکر بھی زیادہ نہیں ہوا ہے اور ان کے تحقیقی کارنامے پوری طرح روشن نہیں ہوئے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

جواب۔راجستھان میں تحقیق کے حوالے سے جماعتی سطح پر کبھی کوئی کام نہیں ہوا۔ادبی انجمنیں مشاعرے منعقد کرنے کو ہی کارثواب سمجھتی رہیں۔کوئی ادارہ ایسا نہیں بنایا گیا جو محققین کو ایک دوسرے سے جوڑ کر رکھے اوران کے کام کو منظرعام پر لائے پرنٹنگ پریس کی کمی کو بھی اس میں بڑادخل رہا۔

سوال۔۱۴۔فتح پور شیخاواٹی کے بزرگ خواجہ نجم الدین چشتی نے جہاں روحانیت کے چشمے بہائے وہاں جنگی پیمانہ پر تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔دنیا سے ان کی رخصتی کو ایک صدی سے زائد کا عرصہ بیت گیا۔انھوں نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں باون کتابیں لکھیں ۔اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ان کی تصانیف موجود ہیں۔۔مختلف تحقیقی مضامین میں ان کا تھوڑا تھوڑا ذکر ملتا ہے۔مگران کے ادبی کارناموں پر کسی محقق نے یکسوئی سے قلم نہیں اٹھایا ہے۔آپ کی نظر میں اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

جواب۔حضرت خواجہ نجم الدین چشتی کا وصال ۱۲۸۷ھ میں ہوا تھا۔ان کو دنیا سے پردہ کئے ہوئے ڈیڑھ سو سال ہو گئے میرے علم میں ان کی کل تیس کتابیں آئی ہیں جن میں ایک اب بھی غیر مطبوعہ ہے۔ان کے ادبی کارناموں پر کسی محقق نے قلم نہیں اٹھایا۔اس کی کئی وجوہات ہیں۔اول تو یہ تصانیف اس دور کی ہیں جب طباعت واشاعت کی سہولیات فراہم نہیں تھیں۔بالخصوص راجستھان میں تو کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا۔دوم بزرگان دین شہرت سے گریز کرتے تھے۔اس لئے مخطوطہ کی شکل میں چند نسخہ تیار ہوکر خلفا اور مریدین کو دے دئے جاتے تھے۔یہ حضرات بھی تبرک کی طرح انہیں جزدانوں میں رکھ کر کبھی کبھی زیارت کر لیتے تھے۔تبلیغ واشاعت کی کوئی فکر نہیں تھی۔پھر شیخاواٹی کی طرف محققین نے رجوع کیا۔دوری اور اس وقت کی مشکلات سفر اور کبھی کبھی متعلقین کی جانب سے عدم تعاون۔زیادہ حد ادب۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ کچھ زمانہ قبل حضرت کی تصنیف مناقب المحبوبین جو فارسی میں شائع ہو چکی ہے کا اردو ترجمہ پاکستان کے پروفیسر افتخار احمد چشتی نے کیا ہے اور

اسے شائع بھی کر دیا ہے۔

مزید برآں حضرت کی ایک اور تصنیف شجرہ الابرار بھی جناب غلام جیلانی نجمی ترجمہ کے ساتھ منظر عام پر لانے والے ہیں۔ کتاب طباعت کے مراحل میں ہے۔ جیلانی صاحب ماشاءاللہ حضرت کی تصانیف پر کافی کام کر رہے ہیں۔ مجھے اب تک صرف تیس کتابوں کا علم ہو سکا تھا آپنے باون کتابیں دریافت کر لی ہیں۔ مبارک باد۔

سوال۔۱۵۔ آپ کے والد محترم ادبی طور پر کس گھرانے سے منسوب تھے۔ سنا ہے ان کا سلسلۂ تلمذ غالب سے ملتا ہے۔ اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

جواب۔ میرے والد براہ راست ایک واسطہ سے سلسلہ غالب سے جڑے ہوئے تھے۔ وضاحت کے لئے یہاں یہ لکھنا غیر ضروری نہیں ہوگا کہ میرے والد کی پیدائش ۱۸۷۹ء میں جے پور میں ہوئی۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو جے پور میں بعمر ۹۴ سال انتقال ہوا۔ ۱۹۱۲ء میں جب ان کی عمر ۳۳ رسال تھی انھوں نے جے پور میں وکالت شروع کی۔ اس زمانہ میں وہ احمد مرزا آگاہ کے ہر دل عزیز تلامذہ میں شامل تھے۔ آگاہ قلعہ دہلی کی پیدائش تھے، وہیں غالب کے شاگرد ہوئے تھے۔ پیدائشی نام احمد رضا تھا۔ لالہ سری رام نے خم خانہ جاوید میں یہی نام لکھا ہے۔ مگر مسودات میں آگاہ نے خود احمد مرزا خاں لکھا ہے۔ ان کے پوتے ہمارے پڑوس میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ میں نے ان کو خوب دیکھا ہے ان کا نام غیور مرزا تھا۔ ممکن ہے نام کی یہ نئی ترکیب وترتیب قلعہ کی دین ہو۔ جہاں ہر روز اہل علم وادب کو نئے نئے خطابات اور القاب سے نوازا جاتا تھا۔ غیور مرزا کی والدہ بھی نام احمد مرزا خاں ہی بتاتی تھیں۔ خیر یہ تو صرف اس لئے ہے کہ کانوں میں پڑی رہے۔ میرے والد منشی عیوض علی وکیل مرحوم کے ساتھ جونیر کی حیثیت سے آئے تھے۔ اسی زمانہ میں منشی اشفاق رسول جوہر جے پور آ کر وکالت کرنے لگے۔ جوہر کو انور دہلوی سے فیض تلمذ حاصل تھا، جو جے پور میں مقیم تھے۔ وکالت اور شاعری کے دوہرے رشتہ سے میرے والد حضرت فضا اور حضرت جوہر کافی قریب ہو گئے۔ جوہر نے ہمارے مکان کے

بالکل قریب ہی رہائش اختیار کی تھی۔اس لئے تعلقات مستحکم ہوتے گئے۔جوہر نے آگاہ سے میرے والد کو یہ کہہ کر مانگ لیا کہ آپ کی اجازت سے میں انھیں اپنی روش پر بھی مہارت کرانا چاہتا ہوں۔اس طرح فضا، جوہر کے شاگرد ہو گئے۔اور ایک دن وہ آیا کہ ایک ہی جلسہ میں چاند بہاری لال صبا کو مرزا مائل اور محمد ایوب خاں فضا کو اشفاق رسول جوہر کا جانشیں بنایا گیا۔اس طرح جوہر کی طرف سے سے بھی دو واسطوں سے فضا کا شجرہ تلمذ غالب سے مستحکم ہوگیا۔اب یہ خاکسار راجستھان میں اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

سوال۔١٦۔راجستھان میں غالب کے تلامذہ کثرت سے موجود تھے۔بطور خاص جے پور میں۔اس کے بعد مرزا داغ دہلوی سے تلمذ کا سلسلہ رہا۔آپ بتائیں کہ ان دونوں ادبی سلسلوں میں سب سے زیادہ فعال کس سلسلے کے لوگ رہے۔اور ان کی ادبی خدمات کیا ہیں۔

جواب۔اس سوال کا مکمل جواب دینا فی الحال میرے لئے ممکن نہیں۔میری کتابیں اور تحریری یادداشتیں اجمیر میں ہیں اور میں ابھی وہاں سے دور ہوں۔اتنا کہہ سکتا ہوں کہ غالب کے تلامذہ کا اثر یہاں زیادہ رہا مگر ان میں پیش پیش آگاہ ہی رہے۔ظہیر دہلوی نے اپنے لئے وظیفہ جاری کرانے کی تگ و دو میں کچھ شاگرد بھی کئے۔مگر کوئی بھی ابھر کر سامنے نہیں آیا۔انور دہلوی کو جنون کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔خود اپنا ہی دیوان ضائع کر دیا تھا۔بہت کم عمر میں انتقال ہو گیا۔داغ کے کئی شاگردوں نے اجمیر میں ادب کے چراغ جلائے۔یہ لوگ، ریلوے کا بہت بڑا ہیڈ کوارٹر اور بیاور میں بڑے کارخانے ہونے کے سبب یہاں آباد ہوئے۔تفصیل بیان کرنے سے میں فی الحال قاصر ہوں۔

اجمیر میں غالب کے شاگرد عبد الصمد کلیم اور منشی پیارے لال رئیس، دونوں ریلوے میں ملازم تھے۔کلیم صاحب کا قیام نصیر آباد میں رہا اور منشی پیارے لال اجمیر میں رہے۔داغ کے شاگردوں میں عبد اللہ مطلب، پنڈت کیلاش زتشی، حکیم بہاء الدین بہا، عبد الرحیم رحیم، محمد بخش ضبط، میر کرامت علی خلش، اجمیر میں رہے۔یہ سلسلہ بھی

ریلوے کی ملازمت کے سبب رہا۔

سوال۔۱۷۔مولانا احترام الدین شاغل نے تذکرہ شعراے جے پور مرتب کیا۔اس کے بعد جودھپور، اجمیر، اودے پور، بیکانیر کے تذکرے بھی لکھے گئے۔کیا آپ ان تذکروں کے مواد ومتن سے اتفاق فرماتے ہیں یا ان موضوعات پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

جواب۔جیسا کہ میں نے عرض کیا تحقیق عمل جاریہ ہے۔اس کے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔جن حضرات نے یہ تذکرے تحریر کئے ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ادبی اختلافات اور مزید اضافوں کو خوش آمدید کہا جانا چاہئے۔مگر خدا واسطہ کا بیر غیر ادبی امر ہے۔مولانا شاغل ہی کو لیجئے دبے لفظوں میں اعتراض کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے نارنولی اعزا کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور دیگر بعض حضرات کے ساتھ بے اعتنائی برتی۔واقعہ یہ ہے کہ اعزا کے مکمل احوال وکوائف سے وہ واقف تھے ان کی ادبی زندگی کو قریب سے دیکھے ہوئے تھے۔ان کے کلام اور نگارشات کے وہ امین تھے۔لہٰذا ان کے بارے میں قلم روانی سے چلنا قدرتی امر ہے۔دیگر حضرات کے لئے وہ اس عالم ضعیفی میں گھر سے نکلتے تھے اور ادبا کے حالات معلوم کرنے میں صبح سے شام کر دیا کرتے تھے۔کہیں تعاون ملتا کہیں نہیں۔یہ تذکرہ ایک شاہ کار بن کر سامنے آیا۔ورنہ بہت سے حضرات پردۂ گمنامی میں چھپے رہ جاتے۔دیگر حضرات سامنے آئیں اگر خامی ہو تو اس کا تدارک کریں اور کمی ہو تو اضافہ کریں۔یہ ایک بڑی ادبی خدمت ہوگی۔

سوال۔۱۸۔آپ کے شعری مجموعہ طاق نسیاں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں عوامی جذبات کا احساس دلانے والی شاعری غالب ہے۔آپ نے اسے موضوعاتی اور عصری نظموں کا نام دیا ہے۔کیا آپ اپنی زندگی میں عوام سے قریب رہے ان کے مسائل کو سمجھا، ان کے جذبات کو جانا اور طاق نسیاں میں وہ سارا پیش کر دیا۔

جواب۔میں خود بہت جذباتی ہوں۔زندگی کے سرد وگرم کو برتا اور محسوس کیا ہے۔تمام عمر عوام سے قریب رہ کر ان کے مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے میں گزری۔اسی انہماک کے سبب

سے میں نے اس عوامی اور جذباتی شاعری کو موضوعاتی اور عصری شاعری سے تعبیر کیا ہے۔ مجھے آج بھی یہ خطرہ لاحق ہے کہ نئی نسل صرف اردو غزل ہی کو اردو شاعری نہ سمجھنے لگے۔ یہ کینواس بہت بڑا ہے۔ آخر ذوق اور غالب نے سہرے لکھے اور فنی رعایتوں میں ان کو سمویا ہے۔ یہ سہرے ان کے دوادین کی زینت بنے۔ نئے طلبا کے لئے طاق نسیاں میں رکھی ہوئی شاعری کو بے حد ضروری خیال کرتا ہوں۔

سوال۔۱۹۔ کیا آپ عوامی شاعری کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بتائیں کہ اردو میں سب سے پہلا اور سب سے کامیاب عوامی شاعر آپ کسے تسلیم کرتے ہیں۔

جواب۔ میں عوامی شاعری کی نمائندگی کرتا ہوں یا نہیں اس کا فیصلہ قارئین کر سکتے ہیں، میں نہیں۔ میری کتاب 'طاق نسیاں' اور 'پر فضا' آپ کے سامنے ہیں۔ میرے لئے اپنی معلومات اور مطالعہ کی حد تک پہلا عوامی شاعر خسرو ہیں۔ اور ان کی بزرگی کو سلام کرتے ہوئے دوسرے کامیاب عوامی شاعر میں نظیر اکبرآبادی کو سمجھ پایا ہوں۔

سوال۔۲۰۔ حافظ شمسی طہرانی نے آپ کے لئے لکھا ہے کہ آپ کا مزاج لڑکپن سے صوفیانہ رہا ہے۔ برسوں پہلے ڈاکٹر تاراچرن رستوگی نے لکھا تھا کو صوفی ازم سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں اور قران میں تصوف کے موضوع پر کوئی بات نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں تصوف کی حقیقت اور اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

جواب۔ شمسی طہرانی صاحب لڑکپن سے مجھے جانتے ہیں۔ مجھ سے ایک سال جونیر تھے۔ مگر مجھ سے علم و معلومات میں آگے ہیں۔ انھوں نے مجھے قریب سے دیکھا ہے۔ میں ان سے انکار کی جرات نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر تاراچرن رستوگی عالم، ادیب اور محقق ہیں مگر تصوف اور قرآن پر ان کو سند نہیں مانا جا سکتا۔ صوفی ازم کا مثبت تعلق صرف اسلام ہی سے نہیں تمام عالمِ انسانیت سے ہے۔ اور یہ کل مخلوق پر محیط ہے۔ مجھے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر نہیں آتا اس لئے تصوف کی اہمیت اور حقیقت پر روشنی ڈالنا میرے بس کی بات نہیں۔ یہاں تو جنید و بایزید بھی معذور نظر آتے ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اتنا کہہ سکتا

ہوں کہ قران وحدیث کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے جس قانون کا نفاذ کیا گیا یا جن اصولوں کو منضبط کیا گیا وہ شریعت کا قانون ہے۔ جو مکمل ہے اور کافی وشافی ہے۔لیکن شریعت کی پل صراط سے بہ آسانی گزرنے کے لئے طریقت یعنی بہ الفاظ دیگر تصوف کا سہارا نعمت خداوندی ہے۔تصوف کا بنیادی اصول ہے کہ الخلق عیال اللہ یعنی تمام خلقت اللہ کا کنبہ ہے۔اگر خالق کی محبت کے طلبگار ہو تو اس کی مخلوق سے محبت کرو۔ برسوں کا سفر منٹوں میں طے ہو جائیگا۔شریعت میں جن کاموں کو کرنا فرض قرار دیا گیا ان کا کرنا ہم پر لازم آ گیا۔جن کاموں سے روک دیا گیا ان کا نہ کرنا لازم قرار پا گیا۔لہٰذا پاس شریعت طاعت لازمی ہے۔اس سے روگردانی عذاب الٰہی کا موجب ہے۔لیکن اس طاعت لازمی سے آگے اگر طاعت متعدی کو اپنایا جائے تو خدا کی خوشنودی کا باعث ہے۔طاعت لازمی حقوق اللہ سے متعلق ہے طاعت متعدی حقوق العباد سے متعلق ہے۔کسی بھوکے کو کھانا کھلایئے یا کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھئے، کسی کتے کو پانی پلا دیجئے، پھر دیکھئے اللہ کتنا خوش ہوتا ہے۔اگر کوئی انسان صرف اتنا کام کرتا ہے جس کے لئے وہ اپنے مالک کا ملازم ہے تو یہ کوئی احسان نہیں اگر وہ اس سے بڑھ کر خدمت انجام دیتا ہے تو مالک کی نظروں میں بے حد عزیز ہو جائے گا اور خود کو غلام کی جگہ آزاد محسوس کریگا۔بس یہی تصوف اور طریقت کی اہمیت ہے۔تاراچرن رستوگی صاحب کے حوالے پر اقبال کا یہ شعر یاد آ گیا جو انھوں نے نطشے کی قبر پر کہا تھا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

سوال۔۲۱۔دیکھا گیا ہے کہ آجکل کے صوفیوں کو شریعت محمدی سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔بعض مزارات پر نمازوں کے وقت بھی قوال صوفیانہ راگ الاپتے ہیں۔

جواب۔صحیح فرمایا۔ایں سعادت بزور بازو نیست۔ یہ تو anti sufi لابی ہے۔خدا انہیں ہدایت دے۔ جہاں تک مزارات پر نمازوں کے وقت قوالی کا سوال ہے اگر قوال کی آواز

پاس کی مسجد میں نماز میں مخل ہو رہی ہے تو قطعی غلط ہے۔ اگر ایسی جگہ جہاں مسجد نہیں ہے اور قوالی عام طور پر ہوتی رہتی ہے تو کسی شخص کو وہاں نماز کی نیت نہیں باندھنی چاہئے ایسا کر کے وہ خود اپنی نماز مکروہ کرنے کا اندیشہ مول لے گا۔

سوال ۔۲۲۔ اسلام میں جب موسیقی اور گلوکاری کو حرام بتایا گیا ہے پھر قوالی کو ایسی مقبولیت کیوں ملی ۔ کیا قوالی سے تصوف یا تصوف سے قوالی کا کوئی بنیادی رشتہ یا تعلق ہے۔

جواب ۔ اسلام میں موسیقی اور گلوکاری کو حرام بتلایا گیا ہو میرے علم میں نہیں ہے۔ یہ مسلکی اختلافات میں سے ایک ہے۔ اگر اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہوتا تو کیا سلسلہ چشتیہ کے بزرگ ترین صوفیا اسے پسند کرتے ۔ ہرگز نہیں ۔ اس کے برعکس خود قران میں 'رتل القران ترتیلا' کا حکم ہے لہٰذا قران تجوید اور قرات کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ قرات بھی گلوکاری ہے۔ حضرت بلال کی اذان کے لہجہ میں موسیقیت کا عجیب عنصر تھا جس سے سننے والوں کو رقت ہو جاتی تھی۔ نبی کریمؐ جب ہجرت کر کے مدینہ میں داخل ہوئے تو قبیلہ کی معصوم لڑکیوں نے دف بجا کر 'اطلع اعبد علینا' گایا۔ خود آنحضور نے کھڑے رہ کر سنا اور خوشی کا اظہار کیا۔ آج کے آلہ موسیقی ایجاد نہیں ہوئے تھے ورنہ کون جانے کہ استقبال کے وقت ان کا بھی استعمال کیا جاتا۔ غزوات اور جنگوں میں رجز پڑھے جاتے تھے ان میں بھی کبھی کبھی موسیقیت پائی جاتی تھی۔ اسلام میں اس موسیقی کو حرام کہا گیا ہے جو لہو ولعب کیلئے ہو یا جو نفسانی اور شہوانی خیالات کو ابھارے اور اجاگر کرے۔ حضرت محبوب الٰہی جب قوالی سنتے تو حضرت امیر خسرو اور حضرت نصیر الدین چراغ جیسے با کمال صوفیا قوال ہوتے تھے۔ وہاں ساز و آواز دونوں کا امتزاج ہوتا تھا۔ قوالی سے صوفیا کا یہی رشتہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ عالم وجد اور کیف میں پہنچ جاتے ہیں۔ اجمیر میں، میں نے اپنی آنکھوں سے ایک بزرگ صوفی کو دیکھا کہ انہیں کیف ہوا اور وہ سجدہ میں ہو گئے ۔ قوال تکرار کرتے رہے۔ بہت دیر بعد قوالی ختم ہوئی ۔ بزرگ کو چوبداروں نے ہلایا کہ شاید سو گئے ہوں مگر جسم ایک طرف لڑھک گیا۔ روح پرواز کر چکی تھی۔ قوالی روک دی گئی۔ اور

حاضرین نے کھڑے ہو کر تعظیم دی۔

سوال ۔۲۳۔ عام طور پر ہمارے یہاں خداداد نام بہت کم رکھا جاتا ہے۔ غالب کے ایک مشہور شاگرد خداداد سیاح ہوئے ہیں جن کا حوالہ تذکروں میں ملتا ہے۔ غالب کے ایک اور شاگرد حکیم خداداد خاں دہلوی یہاں پونہ میں مدفون ہیں۔ ان کا کچھ کلام میرے پاس ہے۔ جو غیر مطبوعہ ہے۔ ان کی ایک غزل کا مقطع ملاحظہ کریں۔

مانے ہیں اہل ہند خدا داد کا سخن
پہچانتے نہیں ابھی اہل دکن مجھے

آپ کا نام میرے مطالعہ کے حوالہ سے ادبی سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔ کیا خداداد نام کا کوئی اور بھی شاعر اردو ادب میں موجود ہے۔

جواب ۔ میرے علم میں ابھی تک کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ میرا نام خواجہ صاحب کی عطا ہے اور اس سے سنہ پیدائش برآمد ہوتا ہے۔ میرے والد نے آستانہ خواجہ پر دعا کی تھی۔

سب کو پھل پھول باغ دے دیجیے
ایک مجھ کو ایاغ دے دیجیے
ذوق و غالب نہ دیجئے مجھ کو
اس زمانہ کا داغ دے دیجیے

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو' خداداد مونس ۔ زبان خلق میں ۔ ص ۔۵۳۔۵۴)

سوال ۔۲۴۔ آپ اپنے نام کے ساتھ خان بھی لکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں مسلم راجپوت بھی خان لگاتے ہیں، پٹھانوں میں بھی خان لکھا جاتا ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب کون سے خان سے ملتا ہے۔

جواب ۔ میرے پاس کوئی شجرہ محفوظ نہیں ہے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ افغانستان کے یوسف زئی قبیلے سے ہمارا تعلق تھا۔

سوال ۔۲۵۔فن تاریخ گوئی میں آپ بہت آگے نکل چکے ہیں۔اس کی بابت کچھ اظہار خیال کریں۔

جواب۔ مجھے بے حد قلق ہے کہ یہ فن اب دم توڑ رہا ہے۔اب تو یہ عالم ہے کہ اس فن کی بابت اگر کچھ تشویش ہوتو برصغیر میں کوئی نظر نہیں آتا،جس سے گفتگو کی جا سکے۔اس فن کے احیا کے لئے جسب مقدور میں نے ایک کتاب مشکوٰۃ التاریخ بھی تصنیف کی ہے جسے راجستھان اردو اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔اس میں تاریخ گوئی کے بنیادی اور ابتدائی اصول اس نیت سے جمع کئے ہیں کہ اردو کے طلبا انہیں آسانی سے سمجھ سکیں اور اس فن کو معدوم ہونے سے بچالیں۔اس کتاب کے ضمیمہ میں میری وہ تاریخی مناقب شامل ہیں جن کے ہر مصرع میں مادہ تاریخ ہے اور جو میں بیس برس سے لکھ رہا ہوں وہ تاریخی قطعات ہیں۔اپنی طرف سے کچھ نئی صنعتوں کا اضافہ بھی کیا ہے۔خدا کرے یہ کتاب مستقبل کے لئے مفید اور میرے بعد میری زندگی کا ایک سبب بنے۔

سوال ۔۲۶۔اردو ادب کے کالج اور یونیورسٹی کی سطح کے طلبا آپ کی تقاریر اور مقالات دلچسپی سے سنتے ہیں۔درس و تدریس سے وابستہ نہ ہوتے ہوئے بھی طلبا سے اس رشتے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب۔میری ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ میں اپنے سینے کا علم طلبا تک پہنچاؤں اور ان باتوں سے آگاہ کروں جو نصابی کتب میں کم ملتی ہیں۔وہ مجھے پڑھتے ہی نہیں مجھے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ راجستھان یونیورسٹی جے پور سے ایک طالبہ نے مجھ پر مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔اور ایم ڈی ایس یونیورسٹی اجمیر سے ایک طالب علم نے میری شخصیت اور ادبی خدمات اور تاریخ گوئی پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ سپرد قلم کیا۔

سوال ۲۷۔آپ کی اب تک کتنی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ان کی مختصری تفصیل بتائیں اور فرمائیں کہ آپ کے آئندہ اشاعتی منصوبے کیا ہیں۔

جواب۔ اپنی تازہ ترین کتاب 'بکھرے ہوئے اوراق' بھیج رہا ہوں۔ کتابوں کی مختصر تفصیل اس کے فلیپ پر موجود ہے۔ ۲۰۱۳ء سے اب تک جو کچھ لکھا ہے اسے طبع کرانا چاہتا ہوں۔ اپنے والد حضرت فضا کا دیوان سب سے پہلے شائع کرانا تھا۔ مگر اس کی تدوین وقت چاہتی ہے۔ خدا کرے کہ زندگی اتنا ساتھ اور دے دے کہ اس فرض سے سبک دوش ہو جاؤں اور پھر کہوں کے اے موت آ خوش آمدید۔

والسلام

خداداد مونس

۲۶/جولائی۔ ۲۰۱۶ء

کتابوں کی فہرست

۱۔ پُر فضا (غزلیات)

۲۔ مشکوۃ التاریخ (تاریخ گوئی)

۳۔ بخشش کی راہوں میں (سلام و منقبت)

۴۔ سعادت کبریٰ (نعت)

۵۔ ترجمان الفرید (بابا فرید کے کلام کا اردو ترجمہ)

۶۔ دیوان عبدالحمید اخگر

۷۔ کلامِ جوہر

۸۔ طاقِ نسیاں (قدیم اصنافِ شاعری)

۹۔ بکھرے ہوئے اوراق (مجموعۂ مضامین)

☆

ڈاکٹر فیروز احمد

دن، تاریخ، ماہ اور سنہ تو مجھے یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ فتح پور سے پونے جاتے وقت جے پور میں میرا پاکیٹ غائب ہو گیا۔ میں فتح پور سے دو روز قبل جے پور آ گیا تھا اور مسلم مسافر خانہ میں مقیم تھا۔ صبح صبح ہی مجھے اپنی جیب ہلکی محسوس ہوئی، دیکھا تو پاکیٹ نہیں تھا۔ رقم تو چلی گئی تھی ساتھ ہی پونہ کا ٹکٹ بھی مرحوم ہو چکا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اندر سے لرز کر رہ گیا۔ یہاں ایسا کون ہے جو اس مشکل وقت میں میرے کام آ سکتا ہے۔ چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ہر طرف مایوسی ہی نظر آئی۔ اچانک ڈاکٹر فیروز احمد صاحب کی جانب دھیان چلا گیا۔ ان سے ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی تھی، لیکن فون پر اکثر رابطہ ہو جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے موبائیل نمبر میرے پاس تھے۔ فوراً رابطہ قائم کر کے صورت حال سے آگاہ کیا۔ جواب ملا کہ فوراً راجستھان یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں آ جائیں۔ جیب میں تھوڑے سے پیسے تھے۔ آٹو کر کے سیدھا یونیورسٹی چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے تپاک سے ملے اور میرے مطالبہ پر دو ہزار کی رقم فوراً میرے حوالے کر دی۔ لیجئے صاحب ہو گیا تعلق۔ ایک بڑا مسئلہ ایک ہی پل میں حل ہو گیا۔ پونے آنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق اتنی ہی رقم کی کتابیں میں نے ان کو بھجوا دیں اور ان کی معاونت کو ہمیشہ یاد کرتا رہا۔

ایک بار یعنی ۲۰۱۰ء میں ڈاکٹر محبوب راہی اور ادھو مہاجن بسمل کے ساتھ یونیورسٹی جانا ہوا تو ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں ہی شعبہ کے تمام اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ اور ایک اچھی خاصی شعری نشست بھی ہو گئی۔

ڈاکٹر فیروز احمد ایک فعال شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت اپنی جگہ لیکن تحقیق و تنقید کے شعبہ میں بھی ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ جو لوگ اپنے کام میں، اپنی

گفتار میں، اپنے کردار میں سورج مثال ہوتے ہیں وہ جہاں تہاں روشنی پہنچانے کا کام کر تے ہیں۔ وسیم بریلوی کے مطابق:

جہاں بھی جائے گا یہ روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہو تا

یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر فیروز احمد کا تعلق یو پی سے ہے۔ لیکن ان کے عمل کا میدان راجستھان کی سرزمین ہے۔ انھوں نے جو کھویا جو پایا راجستھان کی اسی سرزمین سے پایا۔ میری نظر میں راجستھان سے متعلق ان کی دونوں کتابیں ''راجستھانی اور اردو'' اور ''راجستھان میں اردو'' ایسے کارنامے ہیں جو نظریاتی اختلافات رکھنے کے باوجود رد نہیں کئے جا سکتے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم اپنے ذہن کو وسیع رکھیں۔ دوسرے کے کاموں کی اہمیت کو تسلیم کریں۔ اچھے کارناموں پر کلمہ تحسین بلند کریں۔۔ ایسا کرنے سے ہمیں خود اذیت ناک کرب سے نجات مل جاتی ہے۔ اور ہم کشادہ ذہن رکھنے والوں کی صف میں شمار ہو تے ہیں۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر فیروز احمد زیادہ فعال نظر آنے لگے ہیں۔ اب ان کے شب وروز تحقیق وتنقید کے لئے وقف ہو چکے ہیں۔ وہ ادب کے پوشیدہ خزانوں کی تلاش میں پوری طرح منہمک ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ میرے استفسار پر موصوف نے بہت تفصیل سے اپنی رائے رکھی اور اشاعت کی اجازت دی۔

بقلم

نذیر فتح پوری

ڈاکٹر فیروز احمد سے ایک مکالمہ

سوال نمبر ۱۔ ڈاکٹر صاحب! سنا ہے کہ آپ کا تعلق یو۔پی سے ہے۔یو۔پی میں آپ کب اور کس شہر میں پیدا ہوئے؟

جواب۔ نذیر صاحب! میرا تعلق یو۔پی سے ہی ہے۔اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں گورکھپور نام کا ایک شہر ہے جس کی اپنی تاریخی اور ادبی حیثیت ہے۔اسی شہر میں ۳۰ ردسمبر ۱۹۵۱ء کو ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوا۔

سوال نمبر ۲۔ اپنی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیے؟

جواب۔ میری تعلیم کا ابتدائی مرحلہ گورکھپور میں ہی طے ہوا۔ ہمارے گھر کے قریب انجمن اسلام کے نام سے ایک مدرسہ تھا۔ یہاں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم کا بہت اچھا انتظام تھا۔ چنانچہ ابتداً اسی مدرسے میں داخل کیا گیا۔ بعدازاں گورکھپور کے ہی ایک اسکول میں داخل ہوا لیکن چند مہینے بعد والد صاحب نے جب بنارس (یعنی موجودہ وارانسی) شہر کو مستقل مستقر بنالیا تو ہم سب گورکھپور سے بنارس منتقل ہو گئے۔ یہاں اسکولی تعلیم کے لیے پہلے اینگلو اورینٹل مسلم ہائی اسکول میں اور اس کے بعد کوئینس انٹر کالج میں داخل ہوا۔ یہ دونوں اسکول اور کالج اب بھی موجود ہیں۔ میں نے یہیں سے ہائی اسکول اور انٹر کا امتحان پاس کیا۔انٹر کے بعد چند مہینے بنارس ہندو یونی ورسٹی میں بی۔اے کے لیے داخل ہوا مگر والد صاحب کی علالت اور ان کے اصرار کے سبب ہم سب بنارس سے گورکھپور واپس آ گئے۔ گورکھپور آنے کے چند مہینے بعد والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔اب بنارس واپس جانا ہم لوگوں کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ گورکھپور میں رہ کر ہم نے گورکھپور یونیورسٹی سے ہی بی.اے. اور ایم.اے. کیا۔ ایم.اے. میں چونکہ میرا نمبر سب سے زیادہ تھا اور میری اول پوزیشن تھی اس لیے مجھے ایک طلائی طمغہ بھی ملا۔ میرے ایم.اے. کے ساتھیوں میں قاضی

افضال حسین بھی تھے جو بعد ازاں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی رہے۔ میری طرح اب افضال صاحب بھی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

سوال نمبر۳۔ میں نے سنا ہے کہ جے پور آنے سے قبل بنارس کے ہی کسی کالج میں آپ کا تقرر ہوا تھا؟

جواب۔ جی ہاں۔ جے پور آنے سے قبل میں بنارس کے ہی ایک کالج میں لیکچرر تھا۔ بنارس کا یہ ڈگری کالج جہاں میرا پہلا تقرر ہوا، دراصل مہاراجہ بنارس کا قائم کردہ تھا۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق رجسٹرار ایس. ایل. ڈَر کے ساتھ خود مہاراجہ بنارس بھی اس کمیٹی میں موجود تھے جس نے میرا سلیکشن کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انٹرویو میں انھوں نے اپنی سابقہ ریاست کے حوالے سے یہ جاننا چاہا تھا کہ اردو کا کون سا ادیب ان کی ریاست سے وابستہ رہا۔ میرا جواب سن کر انھوں نے ڈَر صاحب کے کانوں میں چپکے سے کچھ کہا بھی تھا۔ بعد میں باہر موجود دوسرے امیدواروں سے معلوم ہوا تھا کہ یہی سوال مہاراجہ نے بعض دوسرے امیدواروں سے بھی کیا تھا۔ بہرحال میں بنارس کے اس کالج میں ۱۴/۱۱ اکتوبر ۱۹۷۴ء تک رہا۔ ان ایام میں مجھے متعدد بار مہاراجہ بنارس کی لائبریری کے دیکھنے اور وہاں رہ کر گھنٹوں ایسی کتابوں کی فہرست تیار کرنے کا موقع ملا جو ہندو مذہب اور اس کے اکابرین سے متعلق اردو یا فارسی میں لکھی گئیں اور ان کے کتب خانے میں موجود تھیں۔ میں نے مہاراجہ کی ایما پر یہی کام شبلی کالج، اعظم گڈھ جا کر بھی انجام دیا تھا۔ ملازمت کے اس ابتدائی زمانے میں اتنی ساری 'نازنینان حرم' کے درمیان رہ کر گھنٹوں ان سے دل بہلانے کا احساس اب بھی باقی ہے۔

سوال نمبر۴۔ بنارس سے جے پور کب اور کیسے آنا ہوا۔ کوئی خاص وجہ؟

جواب۔ بنارس سے جے پور آنے کا واقعہ محض قسمت کا کھیل ہے۔ آپ نے جاننا چاہا ہے اس لیے عرض کرتا ہوں کہ جن دنوں میں بنارس میں تھا ان ہی دنوں مجھے پروفیسر سید فضل امام رضوی سے جو اس زمانہ میں جے پور آ چکے تھے، یہ اطلاع ملی کہ راجستھان یونیورسٹی کے

شعبۂ اردو میں دو جگہیں خالی ہیں، اگر میں چاہوں تو درخواست بھیج سکتا ہوں۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ایک سادہ کاغذ پر اپنا بایوڈاٹا بھیج دیا۔ اگست ۱۹۷۴ء میں انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں دسہرے کی تعطیلات سے قبل مجھے راجستھان یونیورسٹی کا ایک عارضی تقرر نامہ ملا۔ مگر میں جے پور اکتوبر کے آخر میں پہنچا اور یکم نومبر ۱۹۷۴ء کو بنارس کے مہاراجہ بلونت سنگھ ڈگری کالج سے مستعفی ہو کر راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک لیکچرر کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اس زمانہ میں میرے ساتھ الہ آباد کے ڈاکٹر عبدالحامد بھی تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یونی ورسٹی نے مختلف شعبوں کے لیے جو تقرر کیے تھے وہ سب کی سب عارضی تھے۔ یعنی صرف چھ مہینے کے لیے۔ میں بنارس میں مستقل تھا مگر یہ عارضی تقرر ذہن میں خدشات پیدا کرتا تھا کہ پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔ بہر حال میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ کالج سے یونی ورسٹی ہر حال میں ایک بہتر جگہ ہوتی ہے۔ اس طرح میں تو یہاں آب ودانے کے زور سے رہ گیا مگر جس خدشے کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ سے عبدالحامد صاحب تقریباً ایک سال بعد یہاں سے واپس الہ آباد چلے گئے اور وہیں رہ کر شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

یوں دیکھا جائے تو میں راجستھان یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو سے ۱۹۷۴ء میں وابستہ ہوا۔ اگر چہ میری تدریسی زندگی کا آغاز اس سے تقریباً ایک سال پہلے ۱۹۷۳ء میں ہو چکا تھا۔

سوال نمبر ۵۔ آپ حیدرآباد میں بھی رہے۔ وہاں کی کچھ تفصیلات بتائیں؟

جواب۔ ۱۹۸۸ء میں جے پور سے ایک سال کی چھٹی لے کر میں حیدرآباد سنٹرل یونی ورسٹی چلا گیا تھا جہاں اسی سال اکبر حیدری کشمیری کا پروفیسر اور میرا تقرر ریڈر کے عہدے پر ہوا تھا۔ اس وقت حیدرآباد کے شعبۂ اردو میں پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر ثمینہ شوکت بھی موجود تھیں۔ شعبہ میں بڑی ہل چل رہتی۔ زبان وادب کے حوالے سے بامقصد گفتگو ہوتی جس میں اساتذہ ہی نہیں طلبا بھی شریک ہوتے ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی کے نئے موضوعات زیر بحث آتے اور طلبا کو اس موضوع پر کام کرنے کے لیے ضروری مواد کہاں

کہاں سے ملے گا، یہ اوراس طرح کے دوسرے امور پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ ادارۂ ادبیات اردو، آصفیہ لائبریری اور اردو ریسرچ سنٹر تو ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں معروف ہیں لیکن سالار جنگ میوزیم میں بھی قدیم کتب ورسائل کا بڑا ذخیرہ ہے اور تحقیق کے خوگر اکثر یہاں سے اپنے کام کا مواد حاصل کرتے ہیں۔

میں حیدرآباد میں جب تک رہا، اکثر اردو ریسرچ سنٹر جایا کرتا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہفتے میں کم از کم دو دن وہیں رہتا۔ عبدالصمد صاحب مجھ پر مہربان تھے۔ قلمی نسخوں کے علاوہ قدیم کتب ورسائل کا بڑا ذخیرہ ان کے کتب خانے میں موجود تھا۔ مجھے جن کتابوں کی ضرورت ہوتی، اگر وہ کتابیں ان کے کتب خانے میں موجود ہوتیں تو صمد صاحب فوراً فراہم کردیتے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ۲۰۱۳ء میں ایک سلیکشن کمیٹی کا ممبر ہوکر حیدرآباد کی مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی میں جانا ہوا۔ وہاں انٹرویو میں شریک ہونے والوں میں سے کسی کا انتخاب نہیں ہوسکا۔ چنانچہ وائس چانسلر نے کہا کہ آپ ابھی ریٹائر ہوئے ہیں اور یہاں ریٹائرمنٹ ۶۵ سال کی عمر میں ہوتا ہے تو کیوں نہ آپ ہماری یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں آ جائیں۔ ان کی اس بات کی تائید دوسرے ممبران نے بھی کی اور میں حیدرآباد کے شعبۂ اردو میں پہلے بطور 'مشیر' اور اس کے چند مہینے بعد اسی شعبے میں پروفیسر کے عہدے پر تقریباً دوسال تک کام کرتا رہا۔ یوں حیدرآباد میں مجھے دو سنٹرل یونی ورسٹیز میں کام کرنے کا موقع ملا۔

سوال نمبر ۶۔ حیدرآباد سے جے پور کب آئے اور کیا جے پور میں آپ کی صلاحیتوں کو تسلیم کیا گیا؟

جواب۔ پہلی دفع جب میں حیدرآباد گیا تھا تو وہاں زیادہ سے زیادہ ایک سال رہا۔ وہاں سے جون ۱۹۸۹ء میں جے پور آ گیا تھا۔ اس کے بعد تو میں جے پور میں ہی رہا۔ اب رہا آپ کا یہ سوال کہ کیا جے پور میں میری صلاحیتوں کو تسلیم کیا گیا۔ نذیر صاحب! میں کیا اور میری صلاحیت کیا۔ من آنم کہ من دانم والی بات ہے۔ میں نے اب تک وہی کیا ہے جس کی اجازت میرے ذہن وضمیر نے مجھے دی۔ مجھے اس سے بالکل غرض نہیں کہ دوسرے کیا کہتے

ہیں۔اگر میں دوسروں کی مرضی ومنشا کے مطابق جینے کا عادی ہوتا تو میں وہ نہیں ہوتا جواب ہوں، اگر چہ اب بھی میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے ادبی دنیا سے وابستہ رہ کر کوئی بڑا کام انجام دے دیا ہے۔ ہاں، ادب کے جس شعبے سے مجھے دلچسپی رہی ہے وہ شعبہ ہی کچھ ایسا ہے کہ وہاں سچ پر اصرار کرنا سکھایا جاتا ہے، کسی 'شخصیت' کو دیکھ کر یا اس سے مرعوب ہو کر سچ یا غلط کا فیصلہ کرنا اس شعبے کی عظمت کے منافی ہے۔اس لیے میری نظر میں یہ سوال کسی کی صلاحیتوں کے اعتراف یا عدم اعتراف کا نہیں بلکہ سچ کو انگیز کرنے کا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اس دور میں سچ بات کہنے والوں کے متعلق اکثر لوگ کیا کہتے ہیں۔

سوال نمبر ۷۔آپ کی سخت مزاجی اور طلبا کے ساتھ عدم تعاون کی بات سننے میں آئی ہے؟

جواب۔ اگر ایم اے کرنے کے بعد بھی طالب علم اسم، فعل یا صفت کے بارے میں نہ جانے یا نصاب میں شامل غالبؔ و مومنؔ کو چھوڑیے نظیرؔ و فراقؔ کے چند اشعار بھی وہ صحیح پڑھ نہ سکے تو پھر اس کی شکایت بجا نہیں، بے جا ہے۔ میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو طلبا کے سہارے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے عوض میں ایم فل یا پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے یا لکھوائے جاتے ہیں۔ہاں اگر طالب علم میں واقعی علم کی پیاس ہے اور وہ زبان وادب کی باریکیوں کو سمجھ کر اس راہ میں خوب سے خوب تر ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے میں ہر طرح کی مدد کے لیے تیار رہا ہوں۔ذرا سوچیے چالیس سالہ تدریسی زندگی میں اب سے پہلے کبھی مجھے اس کا پتہ نہیں چلا کہ میں طلبا کے معاملے میں سخت گیر ہوں اور ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتا۔کیا تعاون اسی کا نام ہے کہ طلبا کو مقالہ یا مضمون لکھ کر دے دیا جائے اور وہ سیمینار یا کسی ادبی نشست میں اسے صحیح پڑھ بھی نہ سکیں؟ میرے خیال میں یہ طلبا کو غلط راستے پر ڈالنا ہے۔یہی نہیں بلکہ اس کے اندر جو بھی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اسے کچل ڈالنا ہے تا کہ وہ زندگی بھر گونگا بنا رہے۔ان حالات میں اگر طلبا کو ڈانٹ پلائی جائے تو یہ سخت مزاجی نہیں بلکہ اصول پرستی ہوگی اور اسے عدم تعاون کا نام دینا تو اور بھی غلط ہے۔

سوال نمبر ۸۔راجستھان میں ٹونک اور جے پور کو اردو کے حوالے سے فوقیت حاصل رہی

ہے، کیا کوئی دوسرا شہر بھی ہے جسے اردو کے حوالے سے اہمیت دی جائے؟

جواب۔ آپ کا یہ خیال درست ہے کہ راجستھان میں ٹونک اور جے پور دو ایسے مقامات رہے ہیں جنھیں اردو زبان و ادب کے حوالے سے فوقیت حاصل رہی ہے۔ مگر یہ نہیں بھولنا چاہئیے کہ اجمیر، ناگور، الور، بھرتپور، جودھپور، بیکانیر اور اودے پور بھی وہ مقامات ہیں جہاں اردو کا چراغ جلا اور اس کی روشنی دور تک پھیلی۔ یہی نہیں بلکہ بعض اعتبار سے شیکھاوٹی کے علاقے میں بھی اردو زبان و ادب کے شائقین موجود رہے اور ان کی مساعی جمیلہ سے اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ اب جیسا کہ آپ کا سوال ہے کہ کیا کسی تیسرے شہر کو بھی جے پور اور ٹونک کی طرح اردو کے حوالے سے اہمیت دی جا سکتی ہے، تو میرا جواب یہ ہے کہ اس سلسلے میں اجمیر کو قطعی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر ۹۔ جے پور روز اول سے ایک ثقافتی شہر رہا ہے۔ یہاں میر تقی میرؔ اور مرزا غالبؔ کے شاگرد موجود تھے۔ اردو کی تاریخ میں ان کے تذکرے موجود ہیں۔ جے پور کی فضاؤں میں ایسی کون سی خوشبو بسی ہے کہ جو ملازمت کے سلسلے میں اس شہر میں آیا ہے وہ سب دوشی کے بعد جے پور کا ہی ہو جاتا ہے۔ یہ بات آپ کے تعلق سے بھی کہی جا سکتی ہے؟

جواب۔ جے پور بلا شبہ ایک ثقافتی شہر رہا ہے۔ مختلف علوم وفنون کے ماہرین یہاں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ایسا ہر اس شہر میں ہوتا ہے جہاں علم و ہنر کے قدردان ہوتے ہیں اور گذشتہ زمانے میں تو اس کی ایک دو نہیں سیکڑوں مثالیں موجود ہیں۔ کیا ایک ریاست بننے سے پہلے (۱۸۱۷ء) ٹونک ایسا ہی تھا جیسا نواب امیر خاں یا ان کے بعد وزیر الدولہ اور نواب ابراہیم خاں کے دور میں نظر آتا ہے اور کیا اسے ایک باوقار ریاست بنانے میں ان حضرات کی کوششوں کو دخل نہیں ہے جو کسی دوسرے شہر یا ریاست سے یہاں آئے بلکہ سچ یہ ہے کہ بلوائے گئے۔ ٹونک میں ایک زمانے تک ملکی اور غیر ملکی کا تصور موجود تھا بلکہ شاید اب بھی ہو، یہ غیر ملکی وہ لوگ تھے یا ہیں جن کے آبا واجداد کی ضرورت خود صاحب اقتدار طبقے نے محسوس کی۔ ایسے حضرات اپنی لیاقتوں اور صلاحیتوں کے سبب جانے اور پہچانے گئے اور

ان کی خدمات سے ریاست کے مختلف شعبوں کے نظم ونسق کو فائدہ ہوا۔اب برسوں تک جو لوگ اپنے اصل مستقر سے دور ہو کر یہاں آباد ہو گئے بلکہ یہیں دفن ہو گئے ان کے ورثا کہاں جائیں؟ یوں دیکھا جائے تو ٹونک ہی نہیں بلکہ جے پور، اجمیر، بیکانیر اور بعض دوسرے علاقوں میں ایسے بے شمار خاندان ملیں گے جو مختلف وجوہ سے آباد ہوئے اور عمر کے آخری پڑاؤ پر اپنے اصل وطن کی جانب لوٹنے سے زیادہ یہیں کی خاک میں آسودہ ہونا زیادہ بہتر سمجھا۔ آپ اسے ان شہروں میں پہلے سے آباد قوموں کا جذبۂ خیر سگالی کہیے یا اسے ان شہروں کی تہذیبی خوشبو، ہر صورت میں یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے جہاں سکون واطمینان محسوس ہوتا ہے اور جہاں اس کی پذیرائی ہوتی ہے، وہ اسے اہمیت دیتا ہے اور نتیجتاً وہیں مر کھپ جاتا ہے۔ ایسے لوگ پہلے بھی موجود تھے اور اب بھی ہیں کہ اپنی طویل ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتے۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں کہ اصل وطن نہ سہی لیکن اب تو جے پور ہی وطن ثانی ہے:

لوگ کہتے ہیں ، یہ جے پور ہے
میں سمجھتا ہوں کہ گورکھپور ہے

سوال نمبر ۱۰۔ تحقیق وتنقید کے علاوہ کیا آپ کو شاعری سے بھی دلچسپی رہی ہے؟

جواب۔ نہیں مجھے شاعری سے اس طرح بالکل دلچسپی نہیں رہی جیسے آپ حضرات کو ہے۔ ہاں طالب علمی کے زمانے میں شاعری سے تھوڑی سی رغبت ضرور پیدا ہوئی تھی اور اس کا ایک خاص سبب بھی تھا۔ میں ساتویں یا آٹھویں درجے کا طالب علم تھا اور بنارس کے اینگلو اورینٹل مسلم ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ گھر کے قریب ایک بڑا سا باغ تھا جہاں بچے فٹبال کھیلا کرتے تھے۔ میں بھی ان بچوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتا۔ کھیل کا یہ شوق کچھ اتنا زیادہ تھا کہ میں اپنی تعلیم سے غفلت برتتا رہا۔ میرے گھر کے بالکل سامنے کے مکانات میں ایک مسلم خاندان رہا کرتا تھا۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مجھے اکثر ٹوکتے اور سمجھاتے کہ میں تعلیم سے غفلت نہ برتوں۔ ایک دن یہی بزرگ مجھ سے کہنے لگے کہ کیا

میں اردو پڑھتا ہوں۔ میرے مثبت جواب پر انھوں نے کہا کہ مجھے اردو کی کاپی دکھاؤ۔ میں نے انھیں اپنی اردو کاپی دکھاؤ تو خوش ہو کر بولے کہ تمہارا خط تو بہت اچھا ہے۔ کیا تم میرا ایک ایک کام کردو گے۔ میں نے ہامی بھر لی۔ انھوں نے کہا کہ اتوار کو جب تمہاری چھٹی ہو تو میرے ساتھ کچھ دیر بیٹھ کر میرے مسودے کو صاف صاف لکھ دیا کرو۔ اس طرح جب یہ کام شروع کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے اپنی بیاض کے منتخب کلام کو خوش خط لکھوا رہے تھے۔ اس زمانے میں نہیں معلوم تھا کہ شاعری کیا چیز ہے۔ وہ اکثر مجھ سے اپنی بعض غزلیں ترنم سے پڑھنے کی ہدایت بھی کرتے اور کہتے تھے کہ بتاؤ تمھیں کون سا شعر اچھا لگا۔ میں جس شعر کو اچھا کہتا، وہ اس کے معنی پوچھتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے کہ تم بھی شعر کہا کرو۔ یہ بہت اچھا شوق ہے۔ میں ان کے بار بار کے اصرار پر ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جو کچھ کہتا وہ اسے دیکھتے اور درست کر دیتے۔ وقت گذرتا گیا اور میں ان کی صحبت سے شاعری کی الف بے سیکھتا رہا۔ اس زمانہ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے ۔

نہ جانے تمھیں سے ہے کیوں انسیت
زمانے میں ورنہ حسیں اور بھی ہیں

آگے چل کر شاعری کا مطالعہ تو جاری رہا لیکن پتہ نہیں کیوں اور کیسے میری تخلیقی صلاحیتیں دم توڑ گئیں۔ چنانچہ چند غزلیں، کچھ قطعات اور نظمیں ہیں جنھیں آپ شاعری سے میری دلچسپی کی مثال کہہ سکتے ہیں اور بس۔

سوال نمبر ۱۱۔ تو پھر آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

جواب۔ دراصل میری ادبی زندگی کا آغاز مضمون نویسی سے ہوا۔ میرا پہلا مضمون ۱۹۶۸ء میں یو۔ پی سے شائع ہونے والے اخبار 'سیاست' میں چھپا تھا۔ عنوان تھا 'انسان کامل'۔ میں اس زمانے میں بی۔ اے کے پہلے سال میں تھا اور بنارس سے گورکھپور آ چکا تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرا مضمون جو شائع ہوا وہ اصل میں یونی ورسٹی سطح کے ایک انعامی مقابلے کے لیے لکھا گیا تھا جس کا موضوع تھا: قومی یکجہتی میں طلبا کا حصہ۔ اس مضمون پر اس وقت

مجھے بطور انعام مبلغ پچاس روپے بھی ملے تھے۔ بعد میں اس کی اشاعت نیا دور، لکھنؤ میں بھی ہوئی تھی۔ یہ دونوں مضامین تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں اور نا ہی تنقید سے۔ البتہ ایم۔اے سال دوم میں لکھا گیا تحقیقی مقالہ میری ادبی زندگی کا اس اعتبار سے نقطۂ آغاز ہے کہ اس کی اشاعت بھی ہوئی اور مجھے بزرگوں کی دعائیں بھی نصیب ہوئیں۔

سوال نمبر ۱۲۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو شاعری سے نہیں بلکہ نثر سے دلچسپی رہی اور نثر میں بھی آپ زیادہ تر تحقیق یا پھر تنقید کی جانب متوجہ رہے؟

جواب۔ جی ہاں۔

سوال نمبر ۱۳۔ ابھی آپ نے ایم اے کے دوران لکھے گئے کسی مقالے کا ذکر کیا تھا۔ یہ مقالہ کس موضوع پر لکھا گیا اور اور کیا اس کی اشاعت ہو چکی ہے؟

جواب۔ ایم۔اے کے دوران لکھا گیا یہ مقالہ 'احسان اللہ عباسی: حیات اور کارنامے' کے عنوان سے ۱۹۷۶ء میں دانش محل، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ اسے نہ صرف اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے انعام سے نوازا بلکہ اس کتاب سے متعلق شائع شدہ تبصروں نے مجھ میں مزید کچھ کرنے کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ اس کتاب پر ایک تبصرہ صدق جدید، لکھنؤ کے مدیر مولانا عبدالقوی دریابادی نے بھی کیا تھا۔ یہ نیم ادبی و مذہبی پرچہ لکھنؤ سے ابتدأ مولانا عبد الماجد دریابادی نکالا کرتے تھے جن سے میری ملاقات ان کے انتقال سے ایک دن پہلے لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ صاحب فراش تھے اور غالباً کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو چکے تھے۔ سماعت بھی بہت کمزور ہو چکی تھی۔ میں گورکھپور سے جے پور کے سفر پر تھا اور لکھنؤ میں ٹرین بدلنے کی وجہ سے چند گھنٹوں کے لیے رکا تھا۔ اسٹیشن سے میں سیدھا دانش محل آیا تاکہ وہاں سے کچھ کتابیں خرید سکوں۔ دانش محل کے مالک قبلہ نسیم صاحب مرحوم نے دوران گفتگو مجھے بتایا کہ آپ کی کتاب 'احسان اللہ عباسی' کو مولانا (عبدالماجد دریابادی) نے منگوایا تھا۔ اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ان سے مل لیجیے، ان دنوں وہ سخت علیل ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے ان کی رہائش کا علم نہیں۔

انھوں نے میری یہ مشکل اس طرح حل کر دی کہ ایک صاحب کے ساتھ مجھے صدق جدید کے مدیر کے پاس پہنچا دیا۔عبد القوی صاحب کے ہمراہ میں مولانا کے دولت کدے پر پہنچا۔وہ نیم غنودگی کے عالم تھے۔عبد القوی صاحب نے مجھے مولانا کے قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ذرا بلند آواز میں کہا کہ یہی فیروز احمد ہیں جنھوں نے احسان اللہ عباسی پر کتاب لکھی ہے، آپ سے شرف ملاقات کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔مولانا نے غالباً ساری بات سمجھ لی اور میری طرف دیکھا، کچھ کہا بھی مگر میں سمجھ نہیں سکا۔ان کی آواز حد درجہ نحیف تھی۔ میں ان کے قریب ہی کھڑا تھا۔انھوں نے اپنا ہاتھ اٹھانا چاہا مگر کمزوری کے سبب خود نہیں اٹھا سکے۔عبد القوی صاحب نے ان کی مدد کی اور مولانا کا دست شفقت میرے سر پر رکھ دیا۔میری آنکھیں نم ہوگئیں۔کاش میں چند مہینے قبل ان سے ملا ہوتا۔اسی ملاقات میں عبد القوی صاحب نے مولانا سے کہا تھا کہ فیروز صاحب مہدی بھائی (مہدی افادی) پر بھی رسرچ کر رہے ہیں۔ یہ نام سنتے ہی مولانا ماضی میں کھو سے گئے اور بار بار کچھ کہتے رہے۔یہ بات کم لوگوں کے علم میں ہوگی کہ مہدی افادی اور مولانا عبد الماجد دریا بادی کسی زمانے میں ایک دوسرے کے مکتوب الیہ بھی تھے۔اپنے وقت کے جید عالم کو اس حالت میں دیکھنا میری زندگی کا ایسا واقعہ ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

خیر۔دوسرے دن جب میں جے پور پہنچا تو ریڈیو کی ایک خبر سے معلوم ہوا کہ مولانا عبد الماجد دریا بادی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔کیا بتاؤں کہ اس خبر سے دل پر کیا گذر گئی۔ صدق جدید، لکھنؤ کے آئندہ شمارے میں تبصرہ شائع کرتے ہوئے عبد القوی صاحب نے لکھا تھا کہ ''اس کتاب (یعنی احسان اللہ عباسی: حیات اور خدمات) کا مطالعہ مولانا ـــــ موصوف نے کر لیا تھا اور ارادہ تھا کہ اپنے قلم سے اس پر تبصرہ کریں گے مگر افسوس کہ طویل علالت نے انھیں اس کا موقع نہیں دیا۔ بہر حال اس کتاب کے مرتب کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ مولانا نے اِسے اس لائق سمجھا تھا کہ خود اپنے قلم سے اس پر تبصرہ کرتے''۔

سوال نمبر۱۴۔ آپ جب پہلے پہل تحقیق کی جانب متوجہ ہوئے تو کس جذبے نے آپ کو مہمیز کیا اور یہ بھی کہ آپ نے تخلیق کی بجائے تحقیق اور تنقید کا ہی انتخاب کیوں کیا؟

جواب۔ نذیر صاحب! جذبہ تو وہی تھا جسے 'سچ کی تلاش' سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر اس جذبے کے پیدا ہونے یا بیدار ہونے میں ہمارے اساتذہ کا بڑا دخل ہے۔ ایم اے کے زمانے میں تین اساتذہ تھے جن سے روزانہ سابقہ پڑتا۔ ایک تو صدر شعبہ پروفیسر محمود الٰہی صاحب تھے، دوسرے ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب اور تیسرے ڈاکٹر احمر لاری صاحب۔ اب یہ تینوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ان میں پروفیسر محمود الٰہی صاحب سے ہم طلبا زیادہ متاثر تھے اور اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ صدر شعبہ تھے بلکہ ان کی تدریس کا وہ مخصوص انداز تھا جو ہم لوگوں کو ان کا گرویدہ بنائے ہوئے تھا۔ طلبا کی تربیت کے خیال سے محمود الٰہی صاحب اکثر ہم لوگوں سے کسی خاص موضوع کا ذکر کر کے کہتے کہ لائبریری سے اس موضوع پر دوسری کتابوں کو تلاش کیجیے اور جب ہم لوگ دوسرے دن ان کے سامنے موجود ہوتے تو وہ کتاب کا نام اور پھر اس کے مصنف یا مرتب کا نام پوچھتے، کتاب کب چھپی اور کہاں سے چھپی ہے، یہ پہلا اڈیشن ہے یا دوسرا۔ ان کے ایسے سوالات سے ہمیں اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوتا۔ ہم نے گارساں دی تاسی کا نام پہلی بار ان سے ہی سنا تھا۔ غالباً اس زمانے میں محمود الٰہی صاحب مشہور تذکرہ نویس کریم الدین احمد پر کچھ کام کر رہے تھے۔ اپنی اس کتاب میں انھوں نے جا بجا گارساں دی تاسی کا ذکر کیا ہے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ فرانس کا یہ ادب نواز ایک دن کے لیے بھی ہندوستان نہیں آیا مگر ہندوستان اور اس کے شعر و ادب پر مستقلاً لیکچر دیتا رہا۔ قاضی عبدالودود اور مالک رام کے علاوہ مسعود حسن رضوی ادیب اور ان کے تحقیقی کارناموں کا ذکر بھی ہم نے پہلی بار انھیں سے سنا تھا۔ پروفیسر محمد حسن (جو محمود الٰہی صاحب کے استاد تھے)، پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور اور کلیم الدین احمد کی کتابوں اور ان کے مضامین کا ذکر بھی اکثر کلاس میں ہی ہوتا۔ وہ طلبا کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے کلاس میں ان سے گفتگو کرتے کرتے اچانک میرؔ یا غالبؔ کا کوئی شعر بھی سنا دیتے اور ہم سب محو حیرت ہو کر انھیں

دیکھتے رہتے۔ یا وہ ایسے سوالات بھی کرتے کہ میر و سودا اگرچہ ایک ہی دور کے ہیں لیکن ان میں اتنا فرق کیوں ہیں؟ اور یہ کہ یہ فرق انداز و اسلوب کا ہے یا موضوع و مضامین کا؟ قصیدے کے لیے سازگار ماحول لکھنؤ میں موجود تھا مگر یہاں قصیدے سے زیادہ مرثیہ کو کیوں فروغ حاصل ہوا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوالات سے وہ طلبا کو چونکاتے تھے مگر سچ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے وہ طالب علموں کی تربیت اور ان میں ایسا تجسس پیدا کرنا چاہتے تھے جو انھیں خود کسی نتیجے تک لے جائے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کسی ناقد یا محقق کی رائے کو، خواہ وہ کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو، اس وقت تک تسلیم نہ کیجیے جب تک کہ اس کے پیش کردہ شواہد کی تہہ تک نہ پہنچ جائیے۔ تحقیق سے جو مجھے تھوڑی سی دلچسپی ہے اس کا سبب کلاس روم کا یہی ادبی ماحول تھا جس نے شعر و ادب کی تخلیق میں مضمر حقائق کو ایک مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا احساس پیدا کیا۔ تحقیقی معاملات میں محمود الٰہی صاحب میرے آئیڈیل ہیں۔ احسان اللہ عباسی پر مقالہ لکھتے ہوئے ہم نے ہمیشہ ان کی ہدایات کو مدنظر رکھا تھا۔

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ تخلیق، تحقیق اور تنقید میں سے میں نے تحقیق کا ہی انتخاب کیوں کیا، تو اس کا ایک جواب تو ابھی دیا جا چکا ہے لیکن اس کا ایک دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ یہ تینوں ادب کی مختلف جہات ہیں۔ تخلیق کے بغیر نہ تحقیق ممکن ہے اور نہ ہی ادبی تنقید۔ تحقیق کا مقصد علم میں اضافہ کرنا ہے خواہ یہ اضافہ تحقیق شدہ حقائق کی نئی تعبیر سے متعلق ہو یا زیر بحث موضوع کے بارے میں بالکل نئے حقائق کے منظر عام پر لانے سے۔ تنقید تجزیہ کرتی ہے اور متن کے خوب و ناخوب پہلوؤں کی روشنی میں ادب میں اس کے مقام و مرتبہ کا تعین کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں اپنے الگ الگ مقاصد کے ساتھ ادب کا لازمی حصہ ہیں۔ میں نے تحقیق سے دلچسپی لی اور کوشش کی ہے کہ کسی خاص مسئلے سے متعلق اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، اسے نئے حقائق کی روشنی میں دیکھ سکوں یا پھر ممکن ہو تو اس کی نئی تعبیر پیش کر سکوں۔ مثلاً ایک زمانہ تک یہ کہا جاتا رہا کہ مرزا سلامت علی دبیر کی نثری کتاب ابواب المصائب دراصل قرآن کی سورۂ یوسف کی تفسیر ہے۔ ایسا کہنے والوں

میں پروفیسر زماں آزردہ بھی ہیں، ڈاکٹر کاظم علی خاں بھی اور پروفیسر اکبر حیدری کشمیری بھی۔ ان حضرات کا خیال تھا کہ ابواب المصائب سورۂ یوسف کی تفسیر ہے۔ میں نے اپنے مضمون بعنوان 'لکھنؤ میں اردو نثر اور ابواب المصائب' میں جو شیعہ کالج، لکھنؤ کے ایک بین الاقوامی دبیرؔ سیمینار میں ۱۹۸۶ء میں پیش کیا گیا اور بعد ازاں ہند و پاک دونوں جگہوں پر شائع ہوا، ان حضرات کی موجودگی میں بدلائل ثابت کیا تھا کہ مرزا دبیرؔ کی یہ کتاب سورۂ یوسف کی تفسیر ہرگز نہیں ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اور پروفیسر نیّر مسعود مجلس صدارت میں موجود تھے اور خود کاظم علی خاں اس کی نظامت کر رہے تھے۔ بعد میں مجھے اخبارات کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ میرے موقف کی تائید میں مضمون کو 'حاصل مذاکرہ' قرار دیا گیا۔

سوال نمبر ۱۵۔ تحقیق کے حوالے سے آپ کی اب تک کون کون سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور راجستھان میں آپ کے طویل قیام کو دیکھتے ہوئے یہ سوال بھی لازمی سا ہے کہ ان میں سے کتنی کتابوں کا تعلق راست طور پر راجستھان سے ہے؟

جواب۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ قارئین خود فیصلہ کریں کہ جو کچھ میں اب تک لکھ چکا ہوں وہ کیا اور کس موضوع پر ہے اور اس میں تحقیق کو کتنا دخل ہے۔ لیکن اگر آپ خود مجھ سے جاننا چاہتے ہیں کہ میں نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اس کی تحقیقی اہمیت کیا ہے تو میں اپنی چند کتابوں کا ذکر کروں گا۔ یہ کتابیں ہیں؛ احسان اللہ عباسی: حیات اور کارنامے، (۱۹۷۶ء) مہدی افادی (۱۹۸۵ء)، انتخاب میر ناصر علی دہلوی (۱۹۸۸ء)، نغمات آزادی (تحریک آزادی اور راجستھان کے اردو شعراء۔ ۱۹۹۳ء)، باغ و بہار (۲۰۱۲)، راجستھانی اور اردو (۲۰۱۳ء) کے علاوہ راجستھان میں اردو (جلد اول و دوم۔ ۲۰۱۳ء)

احسان اللہ عباسی (م۔ ۱۹۲۸ء) پر لکھی گئی کتاب کا کچھ ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ یہاں صرف یہ اشارہ کافی ہے کہ احسان اللہ عباسی مشرقی اضلاع کے سرسید کہے جاتے ہیں۔ وہ پیشہ کے اعتبار سے تو وکیل تھے مگر زندگی بھر تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہے۔

درجنوں کتابیں لکھیں ۔ ان میں قرآن مجید کا بلا متن ترجمہ بھی ہے ، تاریخِ اسلام بھی ہے، زاہدہ اور المجاہد جیسے دو ناول بھی ہیں، شیکسپیر کے بعض ڈراموں کے ترجمے بھی ہیں اور مسلم قانون سے متعلق اردو اور انگریزی میں کتابوں کے علاوہ عصری مسائل پر لکھے گئے ان کے مضامین بھی۔ وہ بنیادی طور پر اس اصلاحی تحریک کا ایک اہم حصہ تھے جو علی گڈھ تحریک کے نام سے جانی جاتی ہے۔ سر سید نے جب غازی پور کے بعد علی گڈھ میں مدرستہ العلوم قائم کرنے کا فیصلہ کیا اس وقت اس مدرسے میں داخلے کے لیے احسان اللہ عباسی کو اپنے ہمراہ علی گڈھ لے گئے تھے۔ یوں احسان اللہ عباسی مدرستہ العلوم علیگڈھ کے پہلے بیچ کے طالب علم تھے۔ اپنی گوناگوں خدمات کی وجہ سے احسان اللہ عباسی اپنے دور میں بہت مشہور ہوئے۔ اب کتنے لوگ ہیں جو مشرقی اضلاع کے اس سر سید سے واقف ہیں؟

مہدی افادی (م۔۱۹۲۱ء) نے کم لکھا مگر جو کچھ لکھا وہ ایسا تھا کہ علامہ شبلی نعمانی کو کہنا پڑا ' کاش شعرا العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے نصیب ہو جاتے'۔ مہدی سے متعلق میرا یہ کام پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے کیا گیا کام تھا۔ احسان اللہ عباسی کی طرح اس کتاب کو بھی اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے انعام سے نوازا تھا۔ مہدی افادی سے متعلق اب تک یہ بنیادی کتاب ہے۔

میر ناصر علی دہلوی (م۔۱۹۳۲ء) تیرہویں صدی اور صلائے عام وغیرہ پرچوں کے ذریعہ ادبی دنیا سے متعارف ہوئے مگر مزاج میں کچھ ایسا چلبلا پن تھا کہ سر سید نے تہذیب الاخلاق میں مذہب یا نیچر سے متعلق جب بھی کچھ لکھا تو میر صاحب قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتے اور سر سید کے مضمون کا ترکی بہ ترکی جواب کچھ اس انداز میں لکھتے کہ ان کی تحریر انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتی۔ اردو میں انشائیہ نگاری کا چلن اب عام عام ہو چکا ہے مگر سچ یہ ہے کہ اس صنف نثر کو اردو میں رواج دینے والوں میں میر ناصر علی کا نام سر فہرست ہے۔ مہدی افادی اور نیاز فتحپوری کچھ یوں ہی میر ناصر علی دہلوی کے قائل نہیں تھے۔

'نغمات آزادی' جس کا ضمنی نام 'تحریک آزادی اور راجستھان کے اردو شعرا

' بھی ہے، اس لحاظ سے ایک اہم تحقیقی کام ہے کہ آزادی کی تحریک اوراس کے مختلف مظاہر سے متعلق بیرون راجستھان کے شعرا کی تخلیقات تو موجود ہیں اوران کی بنیاد پر ہم آزادی کے حصول میں قلمی جہاد کرنے والے ان شاعروں کی خدمات کو سراہتے بھی ہیں، مگر کیا راجستھان میں بھی ایسے شعرا موجود تھے جن کی تخلیقات کی اشاعت سے تحریک آزادی کو تقویت حاصل ہوئی؟ نغماتِ آزادی اسی سوال کا تفصیلی جواب ہے۔ اس میں پچاس سے زیادہ ایسے شعرا کا کلام بھی ہے، جنھوں نے راجستھان میں دوہرے سیاسی نظام کے باوجود اپنے خیالات وافکار سے تحریک آزادی کے مختلف مظاہر کو تقویت پہنچائی۔ واضح رہے کہ یہ سارا کلام میں نے عصری رسائل و جرائد سے منتخب کیا تھا۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ راجستھان تو رجواڑوں کا دیس رہا، یہاں ایسے شعرا کہاں ملیں گے جن کی تخلیقات کو تحریک آزادی کے تناظر میں دیکھا جا سکے۔

باغ و بہار ہندو پاک میں ہی نہیں بلکہ یورپ کے ملکوں میں بھی شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب گذشتہ دو صدیوں سے ہمارے مختلف نصابات کا حصہ رہی ہے۔ دورِ حاضر میں رشید حسن خاں نے اس کتاب کو جس انداز میں مرتب کیا اور حواشی لکھے وہ بلاشبہ ایک مثالی کارنامہ ہے۔ مگر ان کا پیش کردہ باغ و بہار کا متن تسلی بخش نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دوسروں کی طرح انھوں نے بھی باغ و بہار کے اس متن کو سامنے رکھا تھا جو گلکرسٹ کی زیر نگرانی ۱۸۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ باغ و بہار کے اس متن میں جو غلطیاں تھیں اور جس کی نشاندہی کے لیے ابتداً ایک 'اغلاط نامہ' بھی شامل کیا گیا تھا وہ دراصل ایسی اغلاط تھیں جو پہلی نظر میں سامنے آگئیں۔ سچ یہ ہے کہ اس کے باوجود بھی باغ و بہار کے متن میں متعدد فاش غلطیاں موجود تھیں۔ اب تک ہم ان غلطیوں کو میر امن کے 'مختارات' میں شمار کرتے چلے آئے ہیں اوران کی ہی بنیاد پر باغ و بہار کی نثر اوراس کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایسی اغلاط کو کسی قلمی نسخے کی مدد سے دور کیا جاتا۔ میں نے باغ و بہار کا جو متن شائع کیا ہے، وہ ایک قلمی نسخے پر ہی

مبنی ہے اور اس کی کتابت ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں ہوئی ہے۔ میں نے اصل خطی نسخے کے ۱۵؍صفحات بھی اس میں شامل کر دیے ہیں تا کہ اگر کسی کو شبہ ہو تو خود موازنہ کر لے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ دو سو برسوں میں باغ و بہار کا یہ واحد متن ہے جو متداولہ متون سے نہ صرف مختلف بلکہ صحیح ترین بھی ہے۔

'راجستھانی اور اردو' کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی وہ ابتداً ایک میجر ریسرچ پروجیکٹ کا حصہ تھی۔ اس پروجیکٹ کا باقی حصہ جو ابتدا سے آزادی کے زمانے تک راجستھان میں اردو زبان اور اس کی تخلیقی سرگرمیوں پر مشتمل ہے 'راجستھان میں اردو' (جلد اول و دوم) کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ میرا یہ پروجیکٹ ۲۰۰۸ء کے اکتوبر یا نومبر کے مہینے میں مکمل ہو کر یو جی سی، نئی دہلی کو بھیجا جا چکا تھا۔ 'راجستھانی اور اردو' نامی کتاب تو میں نے خود شائع کی تھی جب کہ 'راجستھان میں اردو' قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی کے مالی تعاون سے منظر عام پر آئی۔ یہ دونوں کتابیں اپنے موضوع کا جیسا اور جتنا احاطہ کرتی ہیں، اس کا اندازہ ان تبصروں سے کیا جا سکتا ہے جو ان کتابوں سے متعلق شائع ہوئے۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ میں نے راجستھان سے صرف نظر نہیں کیا۔ یہاں کے شعر و ادب کے متعلق لکھے گئے مضامین کو اگر فی الوقت زیر بحث نہ بھی لایا جائے تو کم از کم نغمات آزادی، راجستھانی اور اردو کے علاوہ راجستھان میں اردو جیسی کتابیں راجستھان کی ادبی سرگرمیوں سے ہی متعلق ہیں۔

سوال نمبر ۱۶۔ یہ سچ ہے کہ تحقیق کے میدان میں بھی آپ نے اپنے لیے الگ راہ نکالی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ چلتی ڈگر پر چلنے والے نہیں۔ کیا آپ راجستھان کی پرانی تحقیق سے متفق ہیں؟

جواب۔ راجستھان سے باہر یا یہاں رہ کر راجستھان یا مجموعی طور پر اردو شعر و ادب سے متعلق کام کرنے والے متعدد حضرات ہیں۔ مثلاً محمود شیرانی، سلیم جعفر، قاضی معراج دھولپوری، مولانا معنی اجمیری، مولانا معینی اجمیری، الیاس عشقی، مولانا فاضل قرولوی،

مولانا شاغل ، یکتا جودھپوری، مفتوں کوٹوی، فضل متین ، قاضی منظور الحسن برکاتی، صاحبزادہ شوکت علی خاں، ابوالفیض عثمانی، خداداد خاں اور بعض دوسرے حضرات۔ان سب نے اپنے اپنے طور پر راجستھان یا بیرون راجستھان کے شعروادب کو جس نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے اس سے ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ان میں سے ہر شخص نے اپنے اپنے طور پر ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ان کی خدمات کو نظر انداز کر کے ہم دو قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔لیکن تحقیق کے بارے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں حرف آخر کی گنجائش نہیں، وہ بات سچ ہے اور اس سے ان حضرات کو مزید تلاش وجستجو کا موقع ملتا ہے جنھیں تحقیق سے دلچسپی رہی ہے۔میں اس کے لیے زیادہ نہیں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔پہلی مثال تاریخ غریبی کے مصنف سے متعلق ہے کہ اس کا اصل نام کیا تھا۔ محمود شیرانی نے ہی سب سے پہلے تاریخ غریبی کو متعارف کراتے ہوئے ایک نہیں بلکہ دو مضامین میں اس کا ذکر کیا ہے۔مگر ان دونوں مضامین میں وہ تاریخ غریبی کے اصل مصنف کا نام معلوم نہیں کر سکے تھے۔صرف یہ اشارہ کر سکے کہ اس کا اصل نام تو معلوم نہیں لیکن اغلباً عاجز یا غریب تخلص تھا۔بعدازاں تاریخ غریبی کے ایک قلمی نسخے (مخزونہ ٹونک) کے ترقیمے کی بنیاد پر ابوالفیض عثمانی نے ثابت کیا کہ تاریخ غریبی کا اصل مصنف محمد جی میاں ولد شیخ مجتبیٰ ہے۔میرے کتب خانے میں تاریخ غریبی کے دو نسخے ہیں۔ان میں سے ایک میں یہی نام موجود ہے۔اس طرح یہ متحقق ہوسکا کہ تاریخ غریبی جسے اردو زبان کی تشکیل کے سلسلے میں بھی اہمیت حاصل رہی ہے، نہ صرف راجستھان میں لکھی گئی بلکہ اس کا مصنف مہدویہ فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔

اب اس سلسلے کی ایک دوسری بات۔محمود شیرانی اور ابوالفیض عثمانی دونوں حضرات نے صرف تاریخ غریبی کو سامنے رکھا اور اسی کتاب کے حوالے سے محمد جی میاں کی بابت گفتگو کرتے رہے۔ ان میں سے کسی نے بھی محمد جی میاں کی کسی دوسری تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔میں نے جب اس سلسلے میں غور وخوض کیا اور اپنے ان بزرگوں کی تحریر کا غائر

مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ محمد جی میاں نے تاریخ غریبی ہی نہیں بلکہ دو مزید منظوم رسالے بھی مرتب کیے تھے اور اتفاق دیکھیے کہ ان رسالوں کا ذکر بھی محمود شیرانی اور ان کے حوالے سے ابوالفیض عثمانی کے مضامین میں موجود ہے مگر ان میں سے کسی نے ان دو رسائل کو محمد جی میاں کی تصنیف میں شمار نہیں کیا۔ وجہ؟ ہمارے خیال میں اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ شیرانی مرحوم نے جب تاریخ غریبی سے متعلق مضامین لکھے اس وقت تک یہ متحقق نہیں ہو سکا تھا کہ محمد جی میاں ہی اصل میں تاریخ غریبی کے مصنف ہیں۔ عرصے بعد عثمانی صاحب کی تحقیق سے اصل مصنف کا پتہ چلا مگر اس نئی دریافت کے نتیجے میں لازم تھا کہ تاریخ غریبی سے متعلق محمود شیرانی کے مضامین کا از سرِ نو مطالعہ کیا جاتا۔ مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ چنانچہ جب میں نے اس سلسلے میں غور کیا تو ہمیں تاریخ غریبی کے علاوہ دو مزید رسالوں یعنی ’گناہِ کبیرہ‘ اور ’عقائد گروہ مہدویان‘ کا بھی پتہ خود شیرانی صاحب کے مضامین سے چلا۔ اس طرح اب تک کی تحقیق کی روشنی میں یہ تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ تاریخ غریبی کے مصنف سے دو مزید رسائل بھی منسوب ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ کوئی صاحب محمد جی میاں کی کسی نئی کتاب یا رسالے کو دریافت کر لیں۔ تحقیق کا سفر تو یوں ہی چلتا رہتا ہے۔

دوسری مثال بھی ملاحظہ کیجیے۔ ڈاکٹر عثمانی صاحب اور ان کے زیر اثر متعدد دوسرے حضرات اس بات پر مصر ہیں کہ راجستھان میں مرزا اکبر علی بیگ متخلص بہ گلؔ پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اول تو یہ بات عثمانی صاحب سے قبل مولانا شاغلؔ مرحوم تذکرۂ شعرائے جے پور میں کہہ چکے تھے دوم یہ کہ ان دونوں حضرات کا یہ خیال نئی معلومات کی روشنی میں نظر ثانی کا محتاج ہے۔ اس کی تفصیل ’راجستھان میں اردو‘ نامی کتاب کی جلد اول کے مختلف صفحات پر موجود ہے۔ ان صفحات پر جس قدیم شاعر کا ذکر کیا گیا ہے اس کا نام میر فضل علی افضلؔ ہے جس کا تعلق الور کے نزدیک قصبۂ بہادر پور سے تھا اور جس سے ولیؔ دکنی جیسا شاعر بھی بخوبی واقف تھا۔ افضلؔ بہادر پوری (م ۱۷۴۴ء) اب تک کی تحقیق کے مطابق راجستھان کے قدیم ترین صاحب دیوان شاعر ہیں بلکہ بعض حقائق کی روشنی میں شمالی ہند کے بھی۔ یہ بات ذہن میں

رہے کہ ہم نے افضل کو قدیم ترین شاعر کہا ہے، پہلا یا دوسرا نہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تحقیق ہمیں کسی بات کا دعویٰ کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہاں، جب تک افضل کے بارے میں نئی معلومات ہمارے پیش نظر نہیں تھیں، ہم بھی دوسروں کی طرح یہ مانتے تھے کہ گل راجستھان کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ مگر اب جب کہ اس کلیہ پر سوالیہ نشان لگ چکا ہے، ہم نئی معلومات کو آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

سوال نمبر ۱۷۔ آپ نے بے شمار پرانی کتابوں اور رسائل کے حوالے سے راجستھان سے متعلق اپنی کتابوں کو اسناد کا درجہ دینے کی کوشش کی ہے لیکن کیا سبب ہے کہ کہیں بھی میری دو کتابوں کا نام نظر نہیں آتا۔ تاریخ وتذکرہ فتح پور شیکھاوٹی اور اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر۔ کیا ان دونوں کتابوں میں ایک بات بھی ایسی نہیں ملی جو حوالے کے طور پر پیش کی جاسکتی تھی؟

جواب۔ آپ کا یہ خیال اگر چہ درست ہے مگر سچ یہ ہے کہ 'راجستھانی اور اردو' کے نام سے میری کتاب پہلے شائع ہوئی اور آپ کی کتاب 'اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر' بعد میں۔ مجھے اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ آپ اس موضوع پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ اس کا علم بھی مجھے تب ہوا جب آپ نے میری کتاب کے موصول ہونے پر بھیجی گئی رسید میں اپنی اس کتاب کا ذکر کیا۔ آپ کی ہی عنایت سے مجھے یہ کتاب بعد ازاں ملی بھی اور میں نے اسے بغور پڑھا بھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کا موضوع ہی نہیں بلکہ نقطۂ نظر بھی بالکل جدا ہے۔ آپ نے راجستھانی بولیوں پر اردو کا اثر ظاہر کیا ہے اور میں نے اردو زبان پر راجستھانی کے صرفی ونحوی اثرات دکھائے ہیں۔ راجستھانی کے دور رس اثرات سے ابتدائی گجری اور دکنی جیسی زبانیں بھی نہیں بچ سکیں۔

دراصل 'راجستھانی اور اردو' کی اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ شمالی ہند میں اردو زبان کے بتدریج ارتقا سے متعلق تقریباً تین صدیوں تک نظر آنے والے اُس خلا کو جس کا ذکر ہمارے مورخین اکثر کرتے ہیں، راجستھانی کے حوالے سے پُر کیا جاسکے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اردو کا قدیمی نام 'ریختہ' راجستھانی زبان میں بھی مروج رہا اور متعدد راجستھانی شاعروں نے

کثرت سے ریختے بھی لکھے۔ یہ ریختے بلاشبہ دیوناگری رسم الخط میں ہیں لیکن یہ بات کون نہیں جانتا کہ زبان کے ابتدائی ایام میں رسم الخط کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مولوی عبدالحق اوران کے بعد محمود شیرانی نے اپنے مقالات میں بعض قدیم ریختوں کے حوالے سے نویں اور دسویں صدی ہجری میں اردو کے چلن کا جوذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ بلاشبہ اہمیت کا حامل ہے مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے ان اکابرین نے جومثالیں فراہم کی ہیں ان میں کسی بھی ریختہ گو نے اپنی زبان کو ریختہ نہیں کہا جب کہ آپ کا راجستھانی زبان کا شاعر دیوناگری میں لکھی گئی تخلیقات کی زبان کو ریختہ کہتا ہے۔ اب لسانی تعصب کی بنا پر دیوناگری کے ان ریختوں کونظرانداز کردیا جائے تو اور بات ہے، لیکن میں بالکل تیارنہیں کہ اردو کی لسانی تشکیل میں غیر فارسی رسم الخط میں لکھے گئے ان ریختوں سے صرف نظر کرلیا جائے ۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا مگر یہ دیکھ کرخوشی بھی ہوتی ہے کہ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ جیسے ماہرین لسانیات نے ہمارے اس کام کو بنظر استحسان دیکھا ہے۔

آپ کی دوسری کتاب 'تاریخ وتذکرۂ فتح پور شیخاوٹی' یقینی طور پر اہم ہے اور یہ میرے مذکورہ پروجیکٹ سے پہلے شائع بھی ہوچکی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ اتنی اہم کتاب کیسے نظرانداز ہوگئی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ میں نے 'جان گرنتھاولی' کو پیش نظر رکھا جو تمام وکمال ہندی میں شائع ہوئی ہے۔ ہندی میں ہی تاج بی بی کے کارناموں پر بھی کتابیں یا مضامین موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تاج کی تخلیقات کے وہ قلمی نسخے بھی میں نے بنارس کی ایک لائبریری میں دیکھے جو وہاں انتہائی بوسیدہ حالت میں پڑے ہیں۔ بہرحال اگر 'راجستھان میں اردو' کا کوئی دوسرا اڈیشن شائع ہوا تو حوالے کے طور پر آپ کی اس کتاب کا ذکر ضرور شامل ہوگا۔

سوال نمبر ۱۸۔ ملک کی تقسیم کے بعد جب پورے دیش میں افراتفری پھیل چکی تھی، راجستھان (راجپوتانہ) کے لوگ بھی اس کا شکار ہوئے۔ بطور خاص اردو سماج بکھر گیا۔ اردو کے صف اول کے ادیب وشاعر راجستھان سے نقل مکانی کر کے نئے ملک میں

جا کر آباد ہو گئے۔ جب طوفان رک گیا، لوگوں کو ہوش آیا تو کچھ دانشور اور محقق مزاج لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی جڑوں کی تلاش میں کمر کس کر میدان کارزار میں کود پڑے۔ ایسے سرفروشوں میں آپ کس کس کو شمار کرتے ہیں؟ یعنی تقسیم کے بعد راجستھان کا پہلا محقق کون ہے اور وہ کون سی پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر شائع ہوئی؟

جواب۔ جی ہاں! تقسیم کے سبب اردو زبان کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ اس کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔ راجستھان کے تعلق سے ابتداً بہلول خاں داناں اور پھر جمعیۃ العلمائے ہند نے جو جدو جہد کی تھی اس کے نسبتاً بہتر نتائج ذرا بعد میں اس وقت ظاہر ہوئے جب مولانا شاغل انجمن ترقی اردو ہند راجستھان کے سکریٹری بنے۔ بلا شبہ اب حالات میں تبدیلی آرہی ہے اور حکومت کا رویہ بھی پہلا جیسا نہیں تاہم اسکولی سطح پر صورت حال اب بھی نازک ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ آزادی کے بعد ادبی تحقیق سے متعلق کون سی کتاب راجستھان میں شائع ہوئی اور کسے پہلا محقق کہا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کا یہ سوال 'سندی تحقیق' کے بارے میں ہے تو شواہد کی روشنی میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کا نام لیا جا سکتا ہے اور ان کے پی. ایچ. ڈی. کے شائع شدہ مقالے 'راجستھان میں اردو زبان و ادب کے لئے غیر مسلم حضرات کی خدمات' کو پہلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ سوال سندی تحقیق سے متعلق نہیں ہے تو کئی نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان ناموں میں شیرانی کے بعد سلیم جعفر، مولانا فاضل قرولوی، مولانا معینی اجمیری، قاضی معراج دھولپوری، فضل متین، مفتوں کوٹوی وغیرہ کا نام بھی آئے گا۔ یہ سبھی نام ہم نے ادبی تحقیق و تنقید کے حوالے سے لیے ہیں۔ آگے چل کر تو متعدد دوسرے نام بھی اس فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۹۔ آپ کی ایک اہم کتاب 'راجستھان میں اردو' (جلد اول و دوم) کے مطالعے سے آپ کی شدید ذہنی کاوشوں اور تلاش و جستجو کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کو اس موضوع پر تحقیق کرنے کا خیال کیسے آیا؟

جواب۔ پہلے تو اس بات کا شکریہ کہ آپ نے 'راجستھان میں اردو' نامی کتاب میں میری سعی وتلاش کو سراہا۔ اب رہا یہ سوال کہ میں نے اس موضوع پر قلم کیوں اٹھایا؟ اس کے جواب میں میں خود آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا ایک سے موضوع پر ایک سے زیادہ حضرات قلم نہیں اٹھا سکتے؟ کیا یہ حق مجھے یا آپ کو یا پھر کسی اور کو نہیں پہنچتا کہ وہ راجستھان میں تخلیق شدہ ادب کو اپنے طور پر پڑھے اور اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرے؟ شعر وادب کسی کی جاگیر نہیں ہے کہ وہ اس پر اپنا موروثی حق جتائے اور یہ پرچار کرتا پھرے کہ فلاں صاحب نے اسی موضوع پر لکھا جس پر میں نے سب سے پہلے کتاب لکھ ڈالی۔ دراصل دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ بعد کے لکھنے والے یا والوں نے اس موضوع کے ساتھ کیا اور کیسا ردعمل ظاہر کیا ہے اور اس ردعمل کے لیے کیا شواہد فراہم کیے ہیں۔ اگر یہ قید لگادی جائے کہ جس موضوع پر ایک شخص نے کام کر لیا ہے، اس موضوع پر کوئی دوسرا کچھ نہ لکھے تو اس کا نتیجہ آپ جانتے ہیں کیا نکلے گا؟ غور وفکر کی راہیں بند ہو جائیں گی اور ہم خوب و ناخوب یا صحیح اور غلط کے مابین فرق وامتیاز سے محروم ہو جائیں گے۔ ہم زندگی بھر شعر وادب کی تخلیق کو ریاستی تناظر میں دیکھتے رہیں گے اور ان اسباب و علل سے آنکھیں پھیرلیں گے جو فن کی تخلیق میں شریک و سہیم ہو کر اسے عصری معنویت کا حامل بناتے ہیں۔ آپ نے اپنے اسی سوال میں 'راجستھان میں اردو' نامی کتاب کو 'میری شدید ذہنی کاوشوں اور تلاش و جستجو' کا حامل قرار دیا ہے، میں آپ کے اس 'ستائش جنبشِ لب' کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور ہے کہ اس کتاب میں آپ نے ایسی بہت سی باتیں پائی ہوں گی جو اس سے پہلے کبھی سامنے نہیں آئیں۔ خداداد خاں مونس نے کیا خوب کہا تھا کہ 'راجستھان میں اردو (جلد اول و دوم)' میں نسخے تو پرانے ہیں مگر ذائقہ نیا ہے اور اگرچہ اس کی تائید وتردید میں بہت کچھ کہا جائے گا لیکن اس کا سہرا بھی فیروز احمد کے ہی سر بندھے گا۔'' خداداں خاں مونس کا یہ تبصرہ تو آپ کے ہی اسباق میں شائع ہوا تھا۔

سوال نمبر ۲۰۔ راجستھان میں ماہر لسانیات کے طور پر آپ کی نظر میں کس کا نام ہے؟

جواب۔ میں بذات خود لسانیات سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ

لسانیات ایک مفید مطلب شعبۂ علم ہے اور دور حاضر میں اس کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ امریکہ اور یورپ کے اکثر ممالک اور خصوصاً جرمنی، فرانس، انگلستان اور روس میں جس طرح لسانیات پر توجہ مرکوز کی گئی، اس کی وجہ سے لسانیات کی نئی نئی شاخیں وجود میں آگئی ہیں، ان سب پر اگر گہری نظر ہو تو معلوم ہوگا کہ لسانیات کا دائرہ اب بے حد وسیع ہو چکا ہے۔

آپ کے سوال کے تناظر میں دیکھا جائے تو آزادی سے قبل لسانیات سے کسی قدر دلچسپی محمود شیرانی اور ان کے بعد سلیم جعفر کے مضامین میں ملتی ہے۔ شاید یہ بات آپ کے علم میں ہو کہ آزادی سے قبل جب کہ لسانیات سے دلچسپی اتنی عام نہ تھی، راجستھان سے ہی اجمیر کے کسی صاحب نے (اس وقت نام ذہن میں نہیں) لسانیات سے متعلق ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ اس ترجمے میں سلیم جعفر بھی شریک تھے۔ بعد ازاں راجستھان سے ہجرت کرنے والوں میں ڈاکٹر عبدالسلام نے 'عمومی لسانیات: ایک تعارف' کے نام سے ایک کتاب مرتب اور شائع کی۔ بعد کے زمانے میں اس علم سے رغبت کا احساس یا تو 'اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر' یا پھر 'راجستھانی اور اردو' جیسی کتابوں میں نظر آتا ہے۔ اگرچہ ان کتابوں کے مصنفین میں سے، جہاں تک علم زبان یا لسانیات کی وسعت کا سوال ہے، کوئی بھی 'ماہرِ لسانیات' نہیں۔

سوال نمبر ۲۰۔ 'راجستھان میں اردو' نامی کتاب کا تیسرا حصہ کب تک شائع ہو رہا ہے؟

جواب۔ 'راجستھان میں اردو' نامی کتاب کا تیسرا حصہ 'راجستھان کا جدید شعری و نثری ادب: تحقیق و تنقید' کے نام سے شائع ہونے کی امید ہے۔ ہم نے اپنے طور پر اسے مکمل کر دیا ہے۔ دیکھیے اس کی اشاعت کب تک عمل میں آتی ہے۔

سوال نمبر ۲۱۔ میرا خیال ہے کہ راجستھان کے شیکھاواٹی کہلائے جانے والے تین اضلاع سیکر، چورو اور جھن جھنوں میں اردو کے حوالے سے گہرا تحقیقی کام ابھی نہیں ہوا ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے کیا آپ کا تعاون مل سکتا ہے؟

جواب۔ آزادی کے بعد شیکھاوٹی کے علاقوں میں جو تخلیقی سرگرمیاں رہی ہیں، ان کا اب غیر جانبداری کے ساتھ مطالعہ اور تجزیہ ضروری ہے۔ اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ

محاکمہ کرنے والا عصری شاعری کے مختلف فنی اور فکری میلانات پر گہری نظر رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے وسیع مطالعہ کی ضرورت ہے۔ میں خود اگر چہ علم و ادب کا ادنیٰ سا طالب علم ہوں لیکن اس سلسلے میں اگر کسی کو میرے تعاون کی ضرورت ہوگی تو میں حاضر ہوں۔

سوال نمبر۲۲۔ آخری سوال۔ آپ کے آئندہ اشاعتی منصوبے کیا ہیں؟

جواب۔ فی الحال میں افضل جھنجھانوی کی بکٹ کہانی کو مرتب کر کے قومی کونسل کے حوالے کر چکا ہوں۔ اس مثنوی کے بارے میں چند برس قبل میرا ایک تعارفی مضمون فکر و تحقیق، نئی دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ مگر اب بعض دوستوں کا اصرار ہے کہ افضل کی بکٹ کہانی جو شمالی ہند میں امیر خسرو کے بعد اردو شاعری کا نقش اول ہے، اسے ضرور شائع ہونا چاہیئے۔ قومی کونسل سے اگر مالی تعاون ملتا ہے تو بکٹ کہانی کا یہ خطی نسخہ جو اب تک کے تمام نسخوں سے زیادہ قدیم ہے، منظر عام پر آ سکے گا۔ اس کے بعد دو مزید کام ہیں۔ ایک تو راجستھان میں اردو کا تیسرا اور آخری حصہ اب جس قدر جلد ممکن ہو، شائع ہو جانا چاہیئے۔ اس کے بعد سلیم جعفر کے مضامین کو مرتب کرنا ہے۔ یہ شخص غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور بھاشا کے علاوہ انگریزی زبان و ادب پر عبور رکھتا تھا۔ منشی دیا نرائن نگم، مدیر زمانہ اس کے بڑے قدر دان تھے۔ سلیم جعفر کے بیشتر مضامین ان کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت کے ترجمان ہیں۔ فاروقی صاحب کے ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' کے ابتدائی حصہ میں جس سلیم جعفر کا ہلکا سا ذکر ہے وہ یہی شخص ہے جس کے مضامین کو میں مرتب کرنا چاہتا ہوں۔ سلیم جعفر تقسیم ملک کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور وہیں پیوند خاک بھی ہوئے۔

ہاں، میں میر حسن کی مشہور زمانہ مثنوی سحر البیان کے جواب میں لکھی گئی ایک مثنوی 'جواہر البیان' کی اشاعت بھی چاہتا ہوں۔ میرے پاس اس مثنوی کا خطی نسخہ ہے۔ میں اسے مرتب بھی کر چکا ہوں۔ یہ جس شاعر کی تخلیق ہے اس کے صحافتی کارناموں کا ذکر گارساں دی تاسی کے یہاں بھی موجود ہے۔ بس یہی چند کام ہیں جنھیں عمر کے اس آخری حصہ میں انجام دینا چاہتا ہوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ یہ سب ممکن ہوگا یا نہیں۔ ☆

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی

راجستھان کے تمام اضلاع میں ٹونک کی ادبی اور تاریخی دونوں حیثیتیں مسلم ہیں۔راجستھان میں ٹونک کی نوابی اور فتح پور شیخاواٹی کی نوابی اہمیت کی حامل ہے۔تاہم یہاں صرف ادب کے حوالہ سے ہم اپنے رشحات قلم پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اردو ادب کے حوالے سے ٹونک کا ماضی بہت زرخیز ،روشن اور تابناک رہا ہے۔شاعری ،افسانہ ،تنقید اور تحقیق کے میدان میں ٹونک کے اہل قلم نے بہت نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔تقسیم ہند سے قبل یہاں فنکاروں کو نوابی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔زبان وادب کے معاملہ میں بھی نوابوں نے اپنی فعالیت کا ثبوت دیا۔

جب ملک تقسیم ہوا تو سارا سماج،ادب اور فنون لطیفہ کے شیدائی منتشر ہو گئے۔بہت سے اہم شعراء واد بار خت سفر باندھ کر سرحد پار چلے گئے۔اس کے باوجود جو لوگ اپنی دھرتی سے جڑے رہے اور جنھوں نے ہر مصیبت کا مقابلہ کرتے ہوئے ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی ان ان کی تعداد بھی کسی طرح کم نہ تھی۔ظلم اور وقت اپنا اپنا اثر دکھا کر گزر جاتے ہیں۔یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔حالات سنور نے لگے تو قلم کی رفتار اور فکر وفن کی پرواز اپنے عروج کی طرف گامزن ہوتے ہوئے نظر آئی۔اسی ماحول میں عزیز اللہ شیرانی نے اپنے ہونے کا اعلان کیا۔جب وہ شعور کو پہنچے تو ان کے چاروں طرف شعر وادب کی مہک رقص کناں تھی۔اسی مہک نے ان کی مشام جاں کو معطر کیا۔حصول تعلیم کے مدارج طے کرتے کرتے ہی تخلیق وتحریر کے بال گوپالوں سے یارانہ ہوگیا۔قلم سے ایک بار جس کی یاری ہوجاتی ہے اور کتابوں سے جسے عشق ہوجاتا ہے پھر اس کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سارا سب کچھ کتابوں کے درمیان ہی گزرنے لگتا ہے۔عزیز اللہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ٹونک کے ماحول سے نکل کر ان کے مضامین اور تخلیقات ملک کے اردو رسائل کی

زینت بننے لگے۔اور ساتھ ہی ایک تسلسل کے ساتھ کتابوں کی اشاعت بھی ادبی منظر نامے کا حصہ بننے لگیں۔

ان کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی ایک صنف کے سودائی اور کسی ایک راہ کے شیدائی نہیں ہیں۔آپ انہیں افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔بچوں کے شاعر کہہ سکتے ہیں۔تراجم شناسی کے ہنر سے بھی وہ خوب واقفیت رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ ایک اختصار پسند ناقد اور ایماندار مبصر کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔تنقید اور تبصراتی موضوع پر ان کی کئی کتابیں موجود ہیں۔رہا سوال تعلیم کا تو... یہ ان کا محبوب ترین میدان ہے۔اس تعلق سے بھی ان تصانیف اہم ہیں۔

ان سے میری پہلی ملاقات سنہ......میں ٹونک میں ہی ہوئی۔جب دو روز کے لئے فراز حامدی کے ساتھ میں ٹونک چلا گیا تھا۔عزیز اللہ شیرانی کے مکان پر میرے لئے ایک ادبی اعزازی محفل کا انعقاد عمل میں آیا۔تب ان سے بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔دوسری ملاقات کھڑے کھڑے راجستھان اردو اکیڈمی کے انعامی جلسے میں ہوئی۔یہ تقریب جے پور میں ہوئی تھی۔بس مصافحہ کیا اور بغل گیر ہوئے۔ایک دوسرے کی خیریت معلوم کی۔اور اس کے بعد اپنا اپنا انعام لیکر روانہ ہو گئے۔

تیسری ملاقات تین مارچ ۲۰۱۶ء کو ٹونک میں ہوئی۔اور تین روز تک مسلسل ہوتی رہی۔ان تین دنوں میں تکلفات کے پردے اٹھ گئے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنی تازہ تنقیدی کتاب ''قلم کی کاوش'' کی ایک کاپی مجھے پیش کی۔اپنے فکر و فن پر لکھے مضامین کا ایک مسودہ بھی مجھے دکھایا۔ناشتے میں ہمارا ساتھ رہا۔ظہرانے میں ہم نے ایک ایک ہی میز پر کھانا کھایا۔ایک ہی مجلس میں مقالہ خوانی کی۔ایک ہی مشاعرے میں اپنا اپنا کلام پیش کیا۔اور ان کی کتاب 'قلم کی کاوش' کے اجراء کی رسم میرے ہی ہاتھوں انجام پذیر ہو ئی۔

اور اب یہ انٹرویو، یہ تحریری مصاحبہ، یہ سوال جواب،۔دیکھئے اس حوالے سے

عزیز اللہ شیرانی کا ایک دوسرا ہی ادبی پیکر سامنے آیا ہے۔کوئی بھی تخلیقی فنکار اس وقت اندر سے چھوٹتا ہے اور برآمد ہوتا ہے جب کوئی اسے کریدتا ہے۔سوال کے ذریعہ اس کی شخصیت کی گرہ کھولتا ہے۔ایسی ہی دلچسپیاں ان سوالات و جوابات کے مطالعہ کے بعد سامنے آرہی ہیں۔ہمارے سوال تو اپنی جگہ لیکن ڈاکٹر صاحب نے کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ جوابات تحریر کر کے اپنے بارے میں بہت کچھ نیا منظر نامہ قارئین تک پہنچانے کی ایماندارانہ کوشش کی ہے۔جس کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

نذیر فتح پوری

☆

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی سے چند سوالات

1۔سوال۔آپ کی تاریخ پیدائش؟ ولدیت اور ابتدائی تعلیم؟

جواب۔ 15/جون 1954ء مقام ٹونک (راجستھان، ولدیت: حافظ حکیم اللہ شیرانی، دارالعلوم فرقانیہ ٹونک راجستھان میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔

2۔سوال۔آپ کی تعلیمی قابلیت؟

جواب۔ ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، (اردو) بی ایڈ، ایم ایڈ

3۔سوال۔آپ نے کس موضوع پر تحقیقی مقالہ قلم بند کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ؟ آپ کے گائڈ کون تھے؟

جواب۔ میرے تحقیقی مقالہ کا موضوع راجستھان میں مختلف زبانوں (عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، ہندی) کی کتابوں کے اردو تراجم۔ اس مقالہ پر راجستھان یونیورسٹی جے پور نے 1990ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا۔ میرے گائڈ تھے ''ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی سابق پرنسپل گورنمنٹ پی جی کالج، ٹونک

4۔سوال۔کیا آپ سرکاری شعبہ سے وابستہ رہے؟

جواب۔11 ستمبر 1975ء تا جون 2014ء تک سرکاری ملازمت میں رہا۔ پرنسپل سینئر سیکنڈری ایجوکیشن سے ریٹائرڈ ہوا۔ ملازمت کے دوران محکمۂ تعلیم میں کئی عہدوں پر رہا۔ اردو لکچرر، ریسرچ آفیسر، بی آر سی ایف (ایس ایس اے) پرنسپل، ڈسٹرکٹ لٹریسی اینڈ کنٹینیو نگ ایجوکیشن آفیسر۔

5۔سوال۔آپ شیرانی کہلاتے ہیں۔ کیا اختر شیرانی کے خاندان سے آپ کا تعلق ہے؟

جواب۔ اختر شیرانی (چوناوت) شیرانی ہیں۔ اور ہمارا خاندان دیسوالیان شیرانی ہے۔ لفظ شیرانی صفتِ نسبتی نہیں ہے۔ اختر شیرانی کا خاندان چھوٹا کھاٹو (ناگور) راجستھان سے

ٹونک آکر بسا اور اہمارا خاندان تاریخی قلعہ رنتھمبور سے علاؤالدین خلجی کے فتح قلعہ کے بعد ٹونک آیا۔

6۔سوال۔ کیا خاندانی طور پر آپ ابتدا ہی سے ٹونکی ہیں یا آپ کے آباؤاجداد کسی دوسری ریاست سے ٹونک آکر بس گئے تھے۔

جواب۔ ہمارا خاندان ابتداء سے ٹونکی نہیں ہے۔ ہمارے آباؤاجداد رنتھمبور کے زمانے میں فوج کے ساتھ رنتھمبور آئے۔ فتح رنتھمبور کے بعد ذریعۂ معاش کے لئے قلعہ سے نکل کر سوائی مادھو پور، شیر پور، کھنڈار، ملارنا ڈونگر، بونلی اور ٹونک آکر بس گئے۔ یہ علاقہ وسیع جنگلوں اور پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ قدیم زمانے میں ویران جنگل کے جھاڑ کاٹ کر گھر بنا کر رہنے لگے۔ جہاں شیر اور دوسرے جنگلی جانوروں کا خطرہ لاحق رہا۔ جب 1817ء میں ٹونک ریاست قائم ہوئی تو یہاں جگہ جگہ سے لوگ آکر بس گئے۔ ہمارے کچھ بزرگ بھی سوائی مادھو پور سے ٹونک کے محلّہ کالی پلٹن میں آکر بس گئے۔ باقی وہیں رہ گئے۔

7۔سوال۔آپ کے خاندان میں آپ سے پہلے بھی کوئی شعروادب کی شخصیت گزری ہے یا آپ ہی نے سب سے پہلے تخلیقی میدان میں قدم رکھا۔

جواب۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہمارے خاندان میں دینی تعلیم اور حفظ قرآن کی سعادت حاصل رہی کوئی قلم کار نہیں ہوا۔ خاکسار ہی نے شعروادب کی تخلیق میں طبع آزمائی کی۔

8۔سوال ۔آپ کو عمر کے کس حصے میں احساس ہوا کہ آپ کے اندر تخلیقی شعاعیں روشن ہیں۔اور یہ شعاعیں قرطاس کی زینت بننا چاہتی ہیں۔

جواب۔ ابتدائی دینی تعلیم دارالعلوم فرقانیہ میں ہوئی۔1965ء میں امیر گنج مڈل اسکول میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا۔1969ء میں دربار سیکنڈری اسکول ٹونک میں داخلہ لیا۔ اسی دوران کہانی لکھنے کا شوق ہوا۔اس وقت میری عمر 13 سال کی تھی۔گھر میں دینی ماحول ملا۔سادگی صفائی اور اخلاقی قدروں کا پابند رہا۔سیدھی سادی روش،اور معصوم خیالات کے

ہجوم نے سوچ وفکر میں مبتلا کیا۔ اس زمانے میں والد صاحب سماجی اور فلاحی کام کرتے تھے۔ سماج اور قوم کے مسائل اور ان کے حل تلاشنا، فیصلے کرنا، سمجھنا سمجھانا، دو بھائیوں میں صلح کروانا، آپسی جھگڑوں کے نپٹارے کرنا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ اور ہمارا گھر فیصلہ، گھر کے نام سے مشہور تھا۔ اسی ماحول میں تخلیقی شعاعیں روشن ہوئیں۔ آنکھوں دیکھا حال لکھنے کا شوق ہوا۔

9۔سوال۔آپ نے سب سے پہلے کیا لکھا؟ شاعری، افسانہ، نظم یا کوئی مضمون؟

جواب۔سب سے پہلے ایک مضمون لکھا جس کا موضوع تھا۔ ''کیا راجہ مہاراجہ تاریخ کا ایک ورق بن جائیں۔ اس وقت میں گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول ٹونک میں گیارہویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اسکول میگزین کے اردو سیکشن میں 1969ء میں شائع ہوا۔

10۔سوال۔آپ کی پہلی قلمی کاوش کہاں شائع ہوئی؟ اسے دیکھ کر آپ کو کیسا لگا؟

جواب۔پہلی کاوش افسانہ ''ٹھوکریں'' گورنمنٹ کالج ٹونک کی میگزین ''شت دھارا'' اردو سیکشن میں 1972ء میں شائع ہوا۔ اس زمانے میں بی۔اے سال اول کا طالب علم تھا۔ افسانہ چھپنے کے بعد نہ صرف کالج کے طلبہ بلکہ اساتذہ نے بھی تخلیقی کاوش کی ہمت افزائی کی۔ مجھے محسوس ہوا کہ قلم کی کاوش کتابی شکل میں شامل ہوگئی۔ بہت خوشی محسوس ہوئی کس قدر اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا اطمینان ہوا۔ مزید تخلیق کا شوق وذوق پروان چڑھا۔ اور پھر مسلسل دو کہانیاں ''ماضی کا جھروکہ'' اور ''آزر'' شائع ہوئیں۔

11۔سوال۔آپ کتاب دوست ہیں۔ کتاب دوستوں سے دوستی کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کو کتاب شائع کرنے کا حوصلہ کیسے ملا۔ اور اس جسارت کا اظہار آپ نے سب سے پہلے کون سی کتاب کی صورت میں پیش کیا۔

جواب۔کتاب دوست آپ نے بہت اچھا خطاب دیا ہے یہ آپ کی ادب دوستی اور صحافتی اعلیٰ صلاحیت ہے جس کی میں تہہ دل سے تعظیم کرتا ہوں۔ بچپن سے ہی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا تو ہمارے دل میں بھی آیا کہ کیوں نہ ہم بھی کتاب تیار کریں اور اس

کو چھپوائیں۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ چند کہانیاں، چند مضمون جمع کر کے اس کو خوش خط لکھ کر کتابی شکل دی اس کے بعد ٹونک کالج میں انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی آٹھویں کانفرنس 1978ء میں منعقد ہوئی تھی، اس کی مکمل روداد خوش خط لکھ کر کتابی شکل دی۔ جسے ٹونک کے ماہنامہ ''ندیم'' میں شائع کیا گیا۔ بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔

12 سوال۔ اب تک آپ کی کس کس موضوع پر کون کون سی کتاب شائع ہوئی ہے؟

جواب۔ میری کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

مطبوعات: تحقیقی اور تنقیدی کتب

(۱) راجستھان میں اردو تراجم۔

(۲) ادبیاتِ راجستھان۔

(۳) تذکرہ معاصر شعرائے ٹونک

(۴) کاوش قلم (مضامین و مقالات کا مجموعہ)

(۵) تحقیق و تفہیم (مضامین و مقالات کا دوسرا مجموعہ)

(۶) ادبی جائزے (کتب کے تبصرہ اور جائزے)

(۷) ''ادراکِ ادب'' ٹونک ادبی سوسائٹی کے مصنفین کے تخلیقات کا مجموعہ)

(۸) روداد اردو کانفرنس

افسانوی مجموعے:

(۹) سنگِ زر (۱۰) زخموں کے پھول (۱۱) وردان (ہندی میں)

(۱۲) دیپ گیان (ہندی نظمیں)

تعلیمی اور تدریسی کتب:

(۱۳) اردو درس و تدریس (بی ایڈ، بی ایس ٹی سی کے لئے) تین ایڈیشن مزید اضافہ کے ساتھ) پہلا ایڈیشن 2009ء دوسرا 2011ء اور تیسرا ایڈیشن 2014ء

(۱۴) آزمائش اردو (برائے امتحان اردو مدرس)

(۱۵) راجستھان میں اردو تعلیم کا جائزہ

(۱۶) آؤ ہم پڑھیں، مرتبہ: حصہ اول برائے تعلیم بالغان

(۱۷) آؤ ہم پڑھیں۔ مرتبہ حصہ دوم برائے تعلیم بالغان

(۱۸) آؤ ہم پڑھیں مرتبہ حصہ سوم برائے تعلیم بالغان

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن راجستھان اجمیر کے زیر اہتمام مرتبہ مطبوعات 2005ء

(۱۹) ''ہماری زبان'' اردو، نویں جماعت کے لئے۔

(۲۰) ''گلدستۂ ادب'' نثر اردو گیارھویں جماعت کے لئے۔

(۲۱) ''گلدستۂ ادب'' نظم اردو گیارہویں جماعت کے لئے۔

(۲۲) ''گلزارِ ادب'' نظم اردو بارہویں جماعت کے لئے۔

(۲۳) ''گلزارِ ادب'' نثر اردو بارہویں جماعت کے لئے

(۲۴) ''گلستانِ اردو'' دسویں جماعت کے لئے۔

راجستھان مدرسہ بورڈ جے پور کے زیر اہتمام مرتبہ مطبوعات

(۲۵) راجستھان اردو ریڈر درجہ سوم 2008ء

(۲۶) راجستھان اردو ریڈر درجہ دوم، چہارم پنجم کے اسباق

لوک جنبش پریشد جے پور کے زیر اہتمام مرتبہ کتاب۔

(۲۷) اردو شکشا کرمی ٹریننگ ماڈیول'' 2003ء

ایس آئی ای آرٹی اودے پور کے زیر اہتمام مرتبہ کتب

(۲۸) بی ایس ٹی سی مراسلاتی نصاب برائے بی ایس ٹی سی طلبہ)

(۲۹) ''اردو زبان کی تدریس'' برائے دوسرا سال بی ایس ٹی سی۔

زیر اشاعت کتب:

(۳۰) مشقی تدریس (بی ایس ٹی سی۔ بی ایڈ کے لئے)

(۳۱) فکرونظر (مضامین ومقالات کا مجموعہ)

(۳۲) کامیابی کی کہانیاں (بچوں کے لئے)

(۳۳) چہچہاہٹ (نظمیں بچوں کے لئے)

(۳۴) آبشار (غزلوں اورنظموں کا مجموعہ)

(۳۵) راجستھانی کہانیاں (راجستھانی سے اردو میں ترجمہ)

(۳۶) حوصلوں کی کہانیاں (بچوں کے لئے)

13۔سوال۔ایک سوال جو پہلے ہی آجانا چاہئے تھاادب میں آپ نے کس استاد کی شاگردی قبول کی اور کیا آپ اپنے استاد سے مطمئن رہے؟

جواب۔ آپ نے بالکل مناسب جگہ سوال کیا ہے کہ ادب میں آپ نے کس استاد کی شاگردی قبول کی؟ میرا عرض کرنا یہ ہے کہ علم حاصل کرنا ادب تخلیق کرنا اور شاگردی اختیار کرنا، یہ تینوں آموزش علم کے حصے ہیں۔علم کا حصول، معلومات اور تجربات یہ تینوں ماحول اور مشاہدات کے پروردہ ہوتے ہیں۔ جسے تخلیق کار خود حاصل کرتا ہے۔استاد اس کا نگراں ہونے کا کردارادا کرتا ہے۔لیکن وہ بھی ابتدائی مراحل میں۔ مجھے یہ کہنے میں فخر ہے کہ کالج کے زمانہ میں طالب علمی میں مجھے محترم ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔میں نے ان سے ابتدائی مضمون لکھنے کا اسلوب سیکھا۔اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ انفرادی اسلوب اختیار کیا۔ رہی افسانہ نگاری تو اس میں زمانہ ماحول اور معاشرہ نے مجھ سے نئی نئی کہانیاں لکھوائیں۔زندگی بھر یعنی دوران ملازمت شعبۂ تعلیم، اسکول کالج اور طلبہ کے بیچ رہا، ان کی نفسیات تک رسائی کی اور ان کی کہانیاں اور نظمیں لکھ دیں، جو دیکھا محسوس کیا اور لکھ دیا نہ کوئی اصلاح اور نہ کوئی تبدیلی ورنہ پھر تخلیق میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔

14۔سوال۔ٹونک کا سفر میں نے دوبار کیا ہے یہ الگ بات ہے کہ دونوں مرتبہ مجھے ٹونک گھومنے کا اور سیر و تفریح کا موقع نہیں ملا، کیا ٹونک میں حافظ محمود خاں شیرانی اور اختر شیرانی

کی یادگار قائم کی گئی ہے۔کوئی ادبی ادارہ کوئی میوزیم،کوئی کتب خانہ،کسی کالج میں کوئی چیز یا کوئی یادگار گوشہ یا کسی اسکول کا نام یا کسی چوک،کسی باغ،کسی بستی،کسی سڑک کا نام ان دونوں باپ بیٹوں کے نام سے منسوب کیا گیا ہے؟

جواب۔ اہل ٹونک کی خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ٹونک کا دو بار سفر کیا۔زہے نصیب دونوں بار جب تشریف لائے تو یہاں آپ کا بہترین استقبال کیا گیا۔پہلی بار جب آپ تشریف لائے تو خاکسا رنے ٹونک ادبی سوسائٹی کی جانب سے آپ کے اعزاز میں ایک شعری نشست رکھی تھی۔دوسری مرتبہ آپ 2016ء میں آئے تو مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک راجستھان کی جانب سے آپ کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ٹونک میں حافظ محمود خاں شیرانی مدفون ہیں،عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کا پہلا جریدہ جرنل(1982ء)محمود شیرانی نمبر شائع ہوا ان پر سیمینار منعقد ہوا۔ادب کی نصابی کتابوں میں اختر شیرانی کی کئی نظمیں خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔راجستھان اردو اکادمی جے پور کی جانب سے محمود شیرانی ایوارڈ اس ادیب کو دیا جاتا ہے جس نے تحقیق وتنقید میں خوب کام کیا ہے۔

15۔سوال۔کیا ٹونک میں اور پورے راجستھان میں اردو تعلیم کی صورت حال پر آپ روشنی ڈال سکتے ہیں؟ آپ چونکہ تعلیمی شعبوں سے وابستہ رہے ہیں، اس لئے آپ گہرا تجربہ رکھتے ہیں۔

جواب۔ ٹونک اور پورے راجستھان میں اردو تعلیم کی صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ صوبائی سطح پر طلبہ کے اعداد وشمار،تعلیمی اداروں مدرسوں اور اسکولوں کی تعداد،اساتذہ اردو کی تعداد،اردو آبادی کے تناسب میں بہت کم ہے۔راجستھان میں ویسے تو اردو بحیثیت مادری زبان بحیثیت تیسری زبان اور بحیثیت اختیاری زبان پڑھائی جاتی ہے۔لیکن اردو میڈیم اسکولوں کا برا حال ہے طلبہ کی تعداد کم ہے۔کتابوں کی اشاعت نہیں ہونے کے سبب اس کی دستیابی کا مسئلہ ہے۔بنیادی مسائل اور حل کے لئے مندرجہ

ذیل اہم کام نہایت ضروری ہیں۔ نصاب کی اشاعت، اردو میڈیم اسکولوں کا قیام، اردو ٹیچرس ٹریننگ اسکولوں کا قیام،اردو آبادی کا سروے(اعداد و شمار) اساتذہ کے اوریئنٹیشن کا انعقاد۔ٹیکنیکل تعلیم بذریعہ اردو میڈیم مثلاً آئی ٹی آئی، پولیٹیکنیک ٹیلرنگ، کرافٹ وغیرہ اور اساتذہ کے تقرر،اردو لائبریری کا قیام۔

16۔سوال۔اردو پہلے بھی شعروادب کی زبان تھی آج بھی یہ اسی چوراہے پر کھڑی ہے۔ ہم لوگ تقابل ردیف اور شتر گربہ کے جال میں پھڑ پھڑا رہے ہیں۔غزل کی نازک خیالی سے اردو کو نازک اندام بھی نہیں کر رکھا ہے بلکہ اسے نحیف ونزار بھی کر دیا ہے۔ کیا ہم کو یا تعلیم کے ماہرین کو اردو کو جدید سائنسی دھاروں سے جوڑنے کا خیال نہیں آتا یا اس سلسلہ میں کچھ کام ہوا ہے؟تفصیل سے بتائیں۔

جواب۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اردو شعروادب کی زبان ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ عوامی زندگی کی بھی زبان ہے۔دشواری یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام خطوں میں اردو کے ساتھ وہاں کی دوسری مقامی زبانیں اور انگریزی زبان بھی موجود ہے۔جن کی زندگی کے ہر شعبہ میں ضرورت ہے ادھران دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو کا سماج اور معاشرہ سے کاروباری نقطۂ نظر سے ء بہت کم رواج ہے۔ایسے میں اردو کا مسئلہ دشوار ہے۔اس کے باوجود اردو نے اپنا ایک مقام بنایا ہے۔محدود ہی صحیح وہ کاروبار سے اور سائنسی سوچ سے جڑی ہے۔اس کی چند مثالیں اختصار سے پیش کی جارہی ہیں۔ یہ وہ شعبے ہیں جن سے روزمرہ کی زندگی میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ان کے فروغ کی نہایت ضرورت ہے۔

(ا) اردو میں صحافت خصوصاً اخبار ورسائل کی اشاعت اور اس کو پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے ہر گھر میں اردو کا اخبار پڑھا جائے۔ اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اردو کا چلن ہوگا دوسرے ملک اور بیرون ملک کے بارے میں مزید معلومات بڑھے گی ،ہر عمر کے افراد میں اردو پڑھنے کا شوق بڑھے گا۔ اور اردو براہ راست عوام سے جڑ جائے گی۔

(۲) اردو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے جڑ چکی ہے ۔ رابطے کی زبان بن چکی ہے ۔ اس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جانا چاہئے۔ تعلیم گاہوں ، رضا کار تنظیموں ، سرکاری اداروں مدرسہ اور مکتبوں میں کمپیوٹر سینٹر کھولے جائیں ۔ اس سلسلہ میں NCPUL Delhi بہت کوشاں ہے ہندوستان کے ہر علاقے میں کمپیوٹر ڈپلومہ کے سینٹر کھولے گئے ہیں ۔ کافی تعداد میں اردو طلبہ اس سے روزگار حاصل کر رہے ہیں ۔ خوف کفیل ہو رہے ہیں ۔

(۳) اردو خطاطی کے فروغ کی بھی بہت ضرورت ہے ۔ تعلیم گاہوں میں لازمی طور پر اس کی تعلیم ہونا ضروری ہے ۔

(۴) اردو کی کتابوں کی اشاعت خوب ہو رہی ہے ۔ لیکن ان کتابوں میں شاعری افسانہ اور ادب کی بہتات ہے بڑی سنجیدگی سے اردو کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کو اپنا طباعتی نصب العین بدلنا ہوگا ۔ سائنس ، سماجی علوم ، جغرافیہ ، تاریخ ، اقتصادیات ، لسانیات مشقی تدریس اور روزگار سے متعلق کتابیں شائع کرنا چاہئے ۔ NCPUL Delhi اس کی بہترین مثال ہے لیکن ایک پہلو یہاں بھی تشنہ ہے وہ یہ کہ کتابوں کی ترسیل ہندوستان گیر پیمانے پر نہیں ہو رہی ہے ۔ ہونا یہ چاہئے کہ ہندوستان میں جتنی بھی اردو اکادمیاں ہیں ان میں اس طرح کی کتابیں خریدنے کا خاطر خواہ بجٹ ہونا چاہئے ۔ NCPUL Delhi کی کتابیں فروخت کرنے کی اسکیم کے تحت موبائل لائبریری بھی موجود ہے انہیں چاہئے کہ ہر صوبے کی اردو اکادمی اور اس سے متصل اردو کے اہم مراکز پر موبائل لائبریری جائے ۔ اس کے لئے ایک پروجیکٹ بنایا جائے ۔ عموماً یہ دشواری ہے کہ NCPUL کی اہم کتابیں یہاں قصبات اور دور دراز علاقوں میں دستیاب نہیں ہو رہی ہیں ۔ عوام کو اردو سے جوڑنے کے ہزار ہا طریقے ہیں ۔ ان طریقوں کو استعمال کرنے کے لئے فعال اردو خدمت گاروں کی ضرورت ہے ۔ جو مفقود ہے ۔ ہندوستان میں اردو کے فروغ کے لئے تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کو اب وقت کے ساتھ چلنا ہوگا ۔ انہیں نیٹ ورک بنانا ہوگا ۔ اردو کی طباعت و اشاعت کے نظریوں میں تبدیلی لانا ہوگی ۔ نئے

نئے موضوعات کا انتخاب کرنا ہوگا۔ جن لوگوں نے اردو پر جو مصنوعی لبادہ چڑھا رکھا ہے اسے اتار کر عوام کے درمیان آنا ہوگا۔ اور ان سب کے لئے پہلی ضرورت ہے کہ گھر گھر جا کر بچوں کو اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے اصرار کرنا ہوگا۔ انہیں مدرسوں اور اسکولوں میں بھیجنا ہوگا۔ اردو کے بچوں کے ڈراپ آؤٹ پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ اردو کے مدرسین (ابتدائی تا اعلیٰ سطح) کو اردو کے طلبہ کی تعداد بڑھانے میں اپنی بے لوث خدمات دینے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ بچوں کے ادب پر زیادہ سے زیادہ کتابیں لکھنے اور ان کو ان تک پہنچانے کی ضرورت ہے، یہ بچے ہی ہماری زبان کو فروغ دینے کے لئے بنیادی ستون ہیں۔

تجاویز کے نکات:

اردو اخبار و رسائل کی توسیع اشاعت۔ ابتدائی تا اعلیٰ درجات کے اردو نصاب کا انتظام تدریس و تعلیم کے تربیتی مراکز کا قیام۔ سائنس کامرس، تکنیک اور صنعتی تعلیم کا اردو میں انتظام جرنلزم کا فروغ۔ اردو میں اشتہارات کا فروغ۔ سماجی اور عوامی پروگراموں میں اردو کا فروغ اقتصادی اور کاروباری و معاشی نوعیتوں سے اردو زبان کا رشتہ جوڑنا، اردو آبادی کے پسماندہ اور ناخواندہ طبقوں کے لئے تعلیم بالغان کے سینٹروں کی بنیاد۔ ہر صوبے میں اردو تعلیم کا جائزہ لیا جائے۔ اس میں مندرجہ بالا نکات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ''جائزے کی رپورٹ'' شائع کی جائے۔ اس کو عوام تک پہنچایا جائے۔ اور متعلقہ ذمہ داران کو دی جائے اور اس پر عمل کروایا جائے۔

17۔ سوال۔ آج کل جو طلبہ اور طالبات اردو میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ ان کی فہرست طویل ہے۔ جس کو دیکھو کسی شاعر اور ادیب کے فن اور شخصیت کی گرہ کُشائی کر رہا ہے۔ کیا تحقیق کے لئے ہم دوسرے موضوعات تلاش نہیں کر سکتے۔ سو سال پیچھے جانے سے بہتر ہے ہم بیس سال آگے جائیں۔

جواب۔ یونیورسٹی سطح پر نئی تحقیق کے لئے ریسرچ بورڈ بنایا جائے۔ آئندہ موضوعات

اورعنوانات متعین کرے اسی کے مطابق PH.D کے لئے رجسٹریشن کیا جائے۔

18۔سوال۔آپ تخلیقی ذہن رکھتے ہیں۔کیااس سلسلہ میں زبان کے فروغ اور تحقیق کے نئے موضوعات تلاش کرنے کا کوئی لائحہ عمل آپ مرتب کر کے طلبہ اور طالبات تک پہنچا سکتے ہیں۔

جواب۔ مجموعی طور پر تحقیق کے لئے میری چند تجاویز ہیں جن پر غور وخوض اور عمل کی ضرورت ہے۔

(۱) علاقائی اور صوبائی سطح پر اردو زبان وادب کے فروغ پر مدلل تحقیق کی جائے۔

(۲) علاقہ کی موجودہ ادبی کارگزاریوں کو موضوع بنائیں۔

(۳) کسی ایک شاعر یا ادیب کے بجائے ایک ہی مقالہ میں کم سے کم پانچ ادیب وشاعر کو شامل کریں۔

(۴) اصناف نثر و نظم کے مطابق صنف اور اس کے تخلیق کاروں پر مجموعی موضوع دیا جائے۔

(۵) تحقیق کے موضوعات میں وسعت پیدا کی جائے۔

(۱) کسی بھی ادب پارہ کا مطالعہ اس کے سماجی ،تاریخی اور معاشرتی پس منظر میں کیا جائے۔

(۲) علاقائی ادب کی تاریخ مرتب کی جائے۔

(۳) سماجی ،اقتصادی ،سائنسی موضوعات پر تحقیق کروائی جائے۔

(۴) جن موضوعات پر کسی بھی یونیورسٹی میں کام ہو چکا ہے اس پر تحقیق نہ کی جائے اس سے نقل اور دوہران کرنے کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

(۵) کسی بھی پی ایچ ڈی کے خاکہ کے مقاصد تعین کئے جائیں اس میں یہ خیال رہے کہ نئی تحقیق کا تجزیہ اور نتائج بالکل نئے ہوں ، گھسی پٹی زبان میں نہ ہوں۔ جس کا اظہار خاکہ میں بھی کر دیا جائے۔مناسب ہدف مقرر کیا جائے۔یہ چیک

کیا جائے کہ کیا اسکالر نے اس کے مطابق اپنے مقالہ میں نتائج اور تجزیہ صحیح کیا ہے؟

(۶) مقالہ میں دوسرے مصنفین کے بڑے بڑے اقتباسات سے گریز کیا جائے۔ اپنی زبان میں ہی وضاحت اور تنقید کی جائے۔ حوالوں کو نقل کرنے کے بجائے ان کے ماخذ اور صفحہ نمبر ضرور درج کیے جائیں۔

(۷) موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

(۸) تحقیق کے لئے Tools کی اقسام میں اضافہ کریں۔ مثلاً: سوال نامے، فہرست سازی، انٹرویو، آبزرویشن، ملاقاتیں، تاثرات، ماخذات، یہ تمام Tools کو اپنے مقالہ میں شامل کیا جائے۔ اوران کے تجزیہ اور نتائج شامل کئے جائیں۔

(۹) سماجی و تاریخی علوم، سائنسی اور ٹیکنالوجی علوم اور اقتصادی علوم کو بھی تحقیق کا حصہ بنائیں۔

(۱۰) اسکالرس کو خود بخود تحقیق کرنے کے مواقع فراہم کروائے جائیں۔ تحقیق کے گائڈ حضرات خود اپنے اسلوب میں مقالہ لکھنے کی مدد نہ کریں۔ ان میں خود لکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہونے دیجئے۔ ہاں زبان و بیان کی اصلاح ضرور فرمائیں۔ جہاں تک ہو سکے نقل کرنے کی عادت کو دور کریں۔

(۱۱) طلبہ کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی تحقیق کے لئے کوشاں رہیں اپنے موضوع سے متعلق مواد کی تلاش کریں اوران کا حوالہ اپنی ریسرچ میں دیں۔ ان کو نظر انداز نہیں کریں۔

(۱۲) اردو میں نصاب کیسے بنایا جاتا ہے۔ کتابیں کیسے لکھی جاتی ہیں۔ طباعت واشاعت کس طرح ہوتی ہے؟ رضا کارانہ تنظیمیں اور سرکاری ادارے اردو کے فروغ میں کیا رول ادا کرتے ہیں؟ علاقائی ادبی تاریخ، اور مشہور شعراء وادباء کون سے ہیں۔ دوسری زبانوں کی کتابوں کے تراجم۔ علاقہ کے مخطوطات

اور مطبوعات پر روشنی ڈالی جائے۔ اردو اور روزگار کے مسائل اور ان کے حل۔ صحافتی، تاریخی، اقتصادی، ادبی اور طبی موضوعات پر کام ہو۔ پی ایچ ڈی کے دوران قسطوں میں جو کام اسکالر کرتا ہے اس کی جانچ کی جائے اس کی اصلاح اور مشورے دئے جائیں ان کی کمیوں کی نشاندی کی جائے۔ اسکالرس کے مخصوص سیمینار، ورک شاپ یونیورسٹی میں کئے جائیں ان سے اپنے موضوع پر گفتگو کی جائے۔ پی ایچ ڈی میں عملی کام کے بھی نمبر متعین کئے جائیں۔ انہیں گریڈ بھی دینی چاہئے۔ آخر میں مقالہ پر سپروائزر اور ممتحن کو بھی آبزرویشن کے نکات پر مبنی سوال نامہ دے کر ان سے جواب لیا جائے۔ ان کی صرف رپورٹ ہی کافی نہیں ہے۔

19۔ سوال۔ آپ کی جتنی کتابیں میرے پاس ہیں ادبی طور پر تو اہم ہیں ہی لیکن ظاہری شکل وصورت سے بھی کسی سجی سجائی دوشیزہ کی مانند لگتی ہیں۔ یہ بتائیں کہ کیا آپ کی کتاب مالی اعتبار سے آپ کو فائدہ پہنچاتی ہیں یا میری طرح آپ بھی ہدیۂ خلوص کے طور پر احباب میں تقسیم کر دیتے ہیں؟

جواب۔ اردو میں کتابیں لکھنا اور ان کو چھپوانا پھر ان کو تقسیم کرنا بس یہی خلوص کی ایک نشانی بچی ہے۔ اردو کی کتابیں تحفہ میں ہی دی جاتی ہیں۔ جب اردو ہندوستان کی شیریں اور محبوب زبان ہے تو پھر اردو کی کتابیں سجی سجائی دوشیزہ کیوں نہیں ہوسکتیں؟ جن کی شیریں زبانی، نازک خیالی اور شائستگی مشہور ہے۔ اختر شیرانی کی رومانی شاعری میں تو ان دوشیزاؤں کا حسن و جمال بھرا پڑا ہے میں نے تو صرف کتابوں کے ٹائٹل ہی سجائے ہیں۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اختر شیرانی کی تخیلاتی صنف نازک کی بہت ساری محبوبائیں تھیں وہ ہی میرے افسانوی مجموعے زخموں کے پھول، اور سنگِ زر'' میں مختلف ناموں کے ساتھ موجود ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ آج کی سلمٰی، عذرا، ریحانہ، ناہید اور فرزانہ ہیں جو خیالی پیکر نہیں بلکہ حقیقت کی دنیا کے کردار ہیں۔

20۔سوال۔ایک لسانی نوعیت کا سوال کیا،اردو نے راجستھانی بولیوں سے تقویت حاصل کی یا اردو نے راجستھانی بولیوں کو متاثر کیا۔آپ کے یہاں دونوں طرح کی سوچ ملتی ہے وضاحت کریں۔

جواب۔ اردو اور راجستھانی کا لسانی تعلق رہا ہے۔کیوں کہ راجستھانی بولی میں کثرت سے اردو کے الفاظ موجود ہیں۔اور اردو میں کچھ حد تک راجستھانی کے الفاظ موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے بھی تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں طوالت کے خوف سے اتنا عرض کردوں کہ راجستھانی بولی راجستھان کے مختلف علاقوں میں اپنے مخصوص لب ولہجہ میں بولی جاتی ہے۔راجستھان کے علاقائی نام اس طرح ہیں۔ مارواڑی، میواڑی، باگڑ، ڈھونڈھاری، ہاڑوتی، میواتی، برج بھاشا۔ان کے علاوہ راجستھان میں ڈنگل اور پنگل دو زبانیں رائج تھیں۔اردو کی قدیم شعراء کے کلام میں راجستھانی الفاظ موجود رہے ہیں۔مثلاً: ہے تیرا انت نہ پار = کس منہ سے کروں اچار (بذات ہندی از شیخ داؤد) خود تجھے معلوم کرنا ہے یہاں کی منصفی = سن چکا ہوں مقرر شہر جے پور کی ابار۔راجستھانی پر اردو اور فارسی کے اثرات کی کئی مثالیں ہیں۔ مثلاً ایسے الفاظ جو عربی سے راجستھانی میں آئے ،جیسے: ڈھول، (دہل) کماڑ (کمان) مکھمل (مخمل) گرج (غرض) کاگد (کاغذ) ارج (عرض)

21۔سوال۔آزادی کے بعد راجستھان میں کس محقق نے سب سے زیادہ مستند کام کیا۔ کیا اس کے کام پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔

جواب۔آزادی، کے، بعد ڈاکٹر، ابوالفیض، عثمانی (غیر مسلم، حضرات، کی، اردو خدمات) ڈاکٹر فیروز احمد (راجستھان میں اردو) اور راقم الحروف ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے (راجستھان میں اردو تراجم) راجستھان سے متعلق مستند کام کیا ہے۔ان کے علاوہ سندی تحقیق کے ضمن میں: ڈاکٹر قمر جہاں، ڈاکٹر نادرہ خاتون، ڈاکٹر ریاض الدین انصاری، ڈاکٹر قائد علی خاں، ڈاکٹر سنجیدہ بی بی، ڈاکٹر نصرت فاطمہ، ڈاکٹر عبدالماجد چشتی نے

بالترتیب راجستھان میں اردو ادب کی ایک صدی (1857ء سے 1957ء) شعری گلدستے، دہلی اور لکھنؤ کا سلسلۂ تلمذ، نعت گوئی، شاغل حیات اور خدمات، اردو مرثیہ اور سلام گوئی، اجمیر میں اردو ادب پر تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی مقالے لکھے گئے اور لکھے جا رہے ہیں۔

22۔ سوال۔ راجستھان میں شعر و ادب کی صورت حال کیا ہے؟ آج شاعروں میں افسانہ نگاروں میں محققوں ناقدوں میں آپ کسے پہلا نمبر دیتے ہیں؟

جواب۔ راجستھان میں شعر و ادب کی صورت حال امید افزا ہے شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ سامنے کے چند شاعروں میں کے خداداد خاں مونسؔ، احتشام اخترؔ، میکشؔ اجمیری، ش ک نظام، فاروقؔ بخشی، ضیاءؔ ٹونکی، ابرارؔ فائق، تبسم رحمانیؔ، ڈاکٹر جلال توقیرؔ، مختار ٹونکی اور ملکہ تسنیمؔ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ افسانہ نگاروں میں مختار الرحمٰن راہیؔ، مہدی ٹونکی، ڈاکٹر ثروت النساء، فرخندہ ضمیر، شہناز فاطمہ، زینت کیفی اور خاکسار (عزیز اللہ شیرانی) شامل ہیں۔ محققین و ناقدین میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی، ڈاکٹر فیروز احمد، ڈاکٹر مدبر علی زیدی، پروفیسر احتشام اختر، فاروق بخشی، مختار ٹونکی، شاہد احمد جمالی، ڈاکٹر رفعت اختر اور خاکسار (عزیز اللہ شیرانی) کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

23۔ سوال۔ تالیف و تصنیف کے تعلق سے آپ کے آئندہ منصوبے کیا ہیں؟

جواب۔ فی الحال جو کتابیں غیر مطبوعہ ہیں ان کی کمپوزنگ اور اشاعت کرانا ہے۔ بعض کتابوں کی کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ ایسی کتابوں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

1۔ فکر و نظر (تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
2۔ راجستھان میں آزادی کے بعد اردو تراجم
3۔ طبی مخطوطات (عربی فارسی) کے اردو تراجم
4۔ راجستھان میں عربی فارسی کتبات اور ان کی تاریخی اہمیت
5۔ راجستھان میں اردو تعلیم کا جائزہ

6۔ میزان ادب (تبصروں کا مجموعہ)

7۔ راجستھانی کہانیاں (راجستھانی سے اردو میں ترجمہ)

8۔ کسوٹی (''سنگِ زر'' افسانوی مجموعہ کا ہندی ترجمہ)

9۔ کامیابی کی کہانیاں (بچوں کے لئے)

10۔ حوصلوں کی کہانیاں (بچوں کے لئے)

11۔ چہچہاہٹ (بچوں کی نظمیں)

مذکورہ بالا کتابوں کی اشاعت کے علاوہ راجستھان میں اردو تحقیق، تنقید اور تعلیم پر کام کرنے کی سعی کی جائے گی۔

24۔سوال۔ کیا آپ اپنے اب تک کے ادبی اور تعلیمی کاموں سے مطمئن ہیں؟

جواب۔ اللہ کا کرم ہے کہ میں نے جو ادبی اور تعلیمی کام کیے ہیں ان کی خوب پذیرائی ہوئی ہے۔ اور خدا کی ذات سے امید ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ انشاءاللہ۔

☆

شاہد احمد جمالی

زندگی میں کبھی کبھی خوش گوار اتفاقات رونما ہو جاتے ہیں۔اور انسان جو تصور بھی نہیں کرسکتا قدرتی طور پر وہ گراں قدر اشیاء اس کے دامن میں آجاتی ہیں۔ایسا ہی ایک خوش گوار ادبی حادثہ میرے ساتھ اس وقت پیش آیا جب ۱۳ر مارچ ۲۰۱۶ء کو جے پور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر۳ پر کھڑی ہوئی جے پور پونہ سپر فاسٹ میں ایک صاحب شکیل الرحمٰن ملاقات کے لئے آئے۔شکیل الرحمٰن راجستھان کے بزرگ افسانہ نگار مختار الرحمٰن راہی کے صاحب زادے ہیں اور ڈی ڈی اردو، دہلی میں برسرکار ہیں۔موصوف بہت احترام سے ملے اور چند کتابوں کا پاکٹ میرے حوالے کردیا۔اور بتایا کہ شاہد احمد جمالی صاحب نے یہ تحفہ آپ کیلئے بھیجا ہے۔میں شاہد احمد جمالی سے متعارف نہیں تھا۔پہلی بار ان کا نام سنا اور پھر اتنی ساری کتابیں ایک ساتھ دیکھ کر ایک اشتیاق میرے دل میں پیدا ہوا۔صبح نو بجے گاڑی نے اپنی روانگی کا اعلان کیا تو شکیل الرحمٰن صاحب آخری مصافحہ کر کے گاڑی سے اتر گئے۔ان کے جاتے ہی میں نے بہ عجلت تمام کتابوں کو کاغذی پیرہن سے آزاد کیا یہ کئی کتابیں تھیں۔جو تحقیقی موضوعات پر مرتب کی گئی تھیں۔جے پور سے پونہ تک دوران سفر میں جستہ جستہ تمام کتابوں کی ورق گردانی کرچکا تھا۔کتابوں کے اوراق راجستھان کے حوالے سے ماضی کی داستان کا اعادہ کر رہے تھے۔پرانے مضامین نئے لباس میں شائع ہوئے تھے۔کتابیں بے حد خوبصورت تھیں۔ایک کتاب میں جمیل الدین بغدادی کے تعلق سے ایک بہت مختصر سی تحریر پر میری نظر پڑی تو مجھے استادی علامہ کالی داس گپتا رضا کی یاد آئی۔سید جمیل الدین بغدادی سے متعلق ایک اہم مضمون رضا صاحب کا تحریر کردہ ان کی کتاب میں میری نظر سے گزرا تھا۔

میں نے دوسرے دن شاہد احمد جمالی صاحب سے موبائل کے ذریعہ گفتگو کی۔ان کو کتابوں کی اشاعت پر مبارک باد دی اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے راجستھان کے تعلق سے اتنی اہم کتابوں کا تحفہ مجھے عنایت کیا۔جب میں نے جمیل الدین بغدادی کے حوالے سے بتایا کہ آپ نے ان کا بہت ہی مختصر تعارف لکھا ہے۔پھر میں نے رضا صاحب کے مضمون کے

متعلق بتایا تو شاہد احمد صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ رضا صاحب کا یہ مضمون مجھے ارسال کر دیں۔ میں اپنی زیر ترتیب کتاب میں رضا صاحب کے حوالے سے بغدادی صاحب کا مفصل تعارف اور ان کے کوائف شامل کرلونگا۔

پہلے ہی فون پر ساری اجنبیت کافور ہو چکی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے شاہد احمد سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے چند قسطوں میں اپنی تمام کتب مجھے ارسال کر دیں۔ اس میں وہ کتاب بھی شامل تھی جس میں جمیل الدین بغدادی کا اچھا خاصہ تعارف رضا صاحب کے مضمون کی روشنی میں لکھا گیا تھا۔ کتاب کا نام ہے۔ ''راجستھان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین، ۱۹۱۱ء تا ۱۹۵۴ء''۔ عنوان سے کتاب کی اہمیت اور مرتبِ کتاب کی عرق ریزی اور تلاش وجستجو کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں گفت باہمی کے تحت ایک مضمون میرا بھی شامل ہے۔ جس کی چند سطریں ملاحظہ کریں۔

''اس طرح آٹھ دس دن میں ہی مجھے ایسا لگنے لگا کہ جس شخص کا نام شاہد احمد جمالی ہے، یہ اپنے ذہن ودل میں تحقیق کا ایک گرانقدر خزانہ رکھتا ہے۔ ادبی میدان میں اور بطور خاص تحقیق کے سلسلے میں ایسی وارفتگی اور سنجیدگی بہت کم لوگوں میں ملتی ہے۔'' (ص۔۱۶)

میں نے ان چار ماہ کے دوران موبائلی گفتگو کے حوالے سے محسوس کیا کہ شاہد احمد جمالی میری ہی طرح ایک جذباتی مگر سنجیدگی سے اپنا کام انجام دینے والے شخص ہیں۔ وہ جتنا کام کر چکے ہیں اس سے کہیں زیادہ وہ اپنے مستقبل کے اشاعتی منصوبوں کے لئے فکر مند ہیں۔

میری اور ان کی عمر میں صرف بارہ سال کا فرق ہے۔ یعنی عمر میں وہ مجھ سے بارہ سال چھوٹے ہیں۔ لیکن ان کے عزائم بڑے ہیں۔ میرے سوالوں کا انھوں نے مفصل جواب دیا ہے۔ ان جوابات کے مطالعہ سے تحقیق کے ضمن میں کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ دراصل انکشافات ہی اذہان کو مہمیز کر کے آگے کا راستہ دکھاتے ہیں۔ اور مسافروں کو اذن سفر دیتے ہیں۔ ع۔ مسافران جنوں تھک کے بیٹھتے کب ہیں

نذیر فتح پوری۔ پونے

شاہد احمد جمالی سے بات چیت

سوال ۔ا۔ پورا نام۔ تاریخ پیدائش۔ آبائی وطن۔ تعلیم۔ اہل خانہ سے متعلق تفصیلی گفتگو۔

جواب۔ نام۔ شاہد احمد۔ جمالی (سلسلۂ جمالیہ کی نسبت سے)۔

عمر۔۵۸ سال۔ تاریخ پیدائش۔ ۱۵/مارچ ۱۹۵۸ء۔ آبائی وطن۔ جے پور

ولدیت۔ حافظ منظور احمد ادیب۔

جن کو راجستھان اردو اکیڈمی نے ''اردو رتن'' کے خطاب سے نوازا تھا۔

والدہ۔ ریحانہ بیگم۔ اہلیہ۔ ناہید پروین لڑکا۔ فائز احمد۔

بیٹیاں۔ صدف پروین۔ غزالہ پروین۔ تمیم خانم۔

بڑے تایا۔ رضی الدین رضا بے پر۔ چھوٹے تایا۔ حاجی جمیل احمد

چچازاد بھائی۔ عقیل احمد۔ شکیل احمد

تعلیم۔ ایم۔اے اردو (۱۹۸۴ء) راجستھان یونیورسٹی، جے پور

موجودہ حالت میں۔ پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔ میرے مقالہ کا عنوان ہے....

''سید نظیر حسن سخا دہلوی کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ''

سوال ۔۲۔ آپ کے خاندان کے کن کن بزرگوں نے ادب میں کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دئے۔ اور سب سے پہلے کون صاحب کتاب ہوا۔

جواب۔ ہمارے یہاں شروع سے ہی اردو کا ماحول رہا ہے۔ عورت مرد سبھی اردو سے واقف ہیں۔ میرے دادا سلطان الدین عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ والد اور تایا بھی عربی فارسی اور اردو کے تعلیم یافتہ تھے۔ ہمارے مورث اعلیٰ مولوی سراج الدین تھے۔ جن کے ایک بیٹے ٹونک کے دیوان شمس الدین تھے۔ میرے تایا رضی الدین رضا، صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کا قلمی دیوان میرے پاس ہے۔ میرے والد حافظ منظور احمد ادیب صاحب

نے ایک مسودہ ''احمر جے پوری۔سوانح اور کلام'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ان کے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔یہ اور بات ہے کہ دونوں حضرات کی تخلیقات ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکیں۔میں نے رضا صاحب کے دیوان سے منتخب کلام ''پرواز بے پر'' کے نام سے شائع کیا ہے۔رضا صاحب اپنے دور کے جے پور کے واحد مزاح نگار تھے۔والد کا لکھا ہوا مسودہ بھی میں نے ابھی حال ہی میں ان کے ہی نام سے شائع کیا ہے۔اس کے علاوہ دونوں برادران نے ناظم سنبھلی کے قلمی دیوان سے انتخاب کر کے لعل و مذاب کے نام سے شائع کیا تھا۔جس میں اردو اکیڈمی کا تعاون بھی شامل تھا۔یہ دونوں حضرات ہمیشہ ہی ادب نواز بنے رہے۔اپنی تخلیقات شائع نہ کر کے ہمیشہ دوسروں کی شائع کرواتے رہے۔مولانا قمر واحدی کا مجموعہ کلام ''انوارالتجلیات'' اور ان کا ''سفرنامہ'' شائع کیا۔حسین کوثری کا مجموعہ ''حوض کوثر'' کے نام سے شائع کیا۔پارسا کوثری کا مجموعہ کلام 'جام کوثر' دو بار شائع کیا۔کچھ اور بھی ہیں جن کے نام مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں۔اس کے علاوہ ایسا بھی ہوا ہے کہ رضا صاحب نے مطلوب کو نقد مدد فراہم کر دی ہے اور اس نے اپنی مرضی سے اپنا مجموعہ شائع کروا لیا ہے۔میں نے اپنے والد ادیب صاحب کی کچھ تخلیقات کا مجموعہ ابھی حال ہی میں ''گلزار ادیب'' کے نام سے شائع کیا ہے۔جس میں ان کی غزلیں،قطعات اور مضامین وغیرہ ہیں۔

رضا صاحب نے کم و بیش چالیس سال تک مشاعرے منعقد کروائے جن میں کئی آل انڈیا سطح کے تھے۔ان مشاعروں کے فوٹو میرے پاس محفوظ ہیں۔میں ان کی ایک البم تیار کروانے کے موڈ میں ہوں۔اردو اکیڈمی کے قیام کے بعد اس کے تمام ابتدائی پرو گراموں میں رضاؔ برابر کے شریک رہے۔بلکہ اکیڈمی نے کئی پروگرام ان کے دواخانے پر منعقد کروائے۔اکیڈمی کا سب سے پہلا پروگرام 'جشن صبا' تھا۔جو ۳۰/ مارچ ۱۹۸۰ء کو رضا صاحب کے دواخانہ پر ہی منعقد ہوا تھا۔چونکہ اکیڈمی نئی نئی بنی تھی۔بجٹ بہت کم تھا اس لئے رضا صاحب ایسے پروگراموں میں مالی تعاون دینے میں پیش پیش رہا کرتے

تھے۔اسی سے ان کے جذبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

سوال۔۳۔کیا آپ کے خاندان کا کسی روحانی سلسلے سے بھی کوئی تعلق ہے۔

جواب۔ بزرگان دین سے ہمارے خاندان کو شروع سے ہی عقیدت رہی ہے۔ جے پور کے ایک مشہور ولی حافظ عبدالرحیمؒ تو ہمارے گھر پر ہی رہا کرتے تھے۔میرے تایا رضی الدین رضا حضرت چپ شاہؒ کے خلیفہ تھے۔ رضا اپنے وصال سے پہلے چالیس سال تک اپنے مرشد چپ شاہؒ کے تین روزہ عرس کرتے رہے۔ایک دن مشاعرہ،ایک دن چہار بیت اور ایک دن محفل سماع اور قل۔

سوال۔۴۔ آپ اپنے آپ کو جمالی کیوں لکھتے ہیں۔

جواب۔ میں بہت عرصہ سے کسی سلسلہ میں بیعت ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ایک دن جب میں حضرت چپ شاہؒ کے مزار پر چادر پیش کر کے آیا تو رات کو خواب میں عجیب سی باتیں نظر آئیں ایک طرف بہت سی کتابوں کا ڈھیر نظر آیا جن کو میں ترتیب سے جما رہا ہوں اور ایک سفر کی تیاری کر رہا ہوں۔ کچھ ہی عرصے کے بعد میرا ارادہ خود بخود ہانسی جانے کا ہوا۔اپنے چند احباب کے ساتھ میں ہانسی (ہریانہ) گیا۔ جہاں شیخ قطب جمال الدینؒ ہانسوی کا مزار مبارک ہے۔اور آپ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے خلیفہ ہیں۔ہانسی کی یہ درگاہ چار قطب کی درگاہ کہلاتی ہے۔اور سلطان فیروز تغلق کے دور کی بنی ہوئی ہے۔وہاں سے واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ شیخ جمال الدینؒ کے نبیرہ جناب حاجی وقارالرحمن صاحب جے پور آئے ہوئے ہیں۔اللہ نے دل میں ڈالی کہ فوراً جا کر سلام عرض کرنا چاہیے۔میں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ بڑی محبت اور اخلاق سے پیش آئے۔دوسرے دن مجھے بیعت کرنے کے لئے فرما دیا۔اس طرح میں سلسلہ جمالیہ سے بیعت ہو گیا۔اور تب سے میں اپنے نام کے ساتھ جمالی لکھتا ہوں۔اب یہی میرا ادبی نام بن گیا ہے۔

سوال ۵۔آپ اردو تخلیق و تحقیق کی دنیا میں کب آئے۔کس شئے نے آپ کو متاثر کیا۔

جواب۔ کچھ سال پہلے چند سندی تحقیقی مقالے میری نظر سے گزرے۔ جن کا تعلق جے پور سے تھا۔ ان کے موضوعات ایسے تھے کہ ان میں کہیں نہ کہیں میرے بزرگوں کا نام یا حوالہ آنا ناگزیر تھا۔ جیسے چند بہاری لال صبؔا، چاند نرائن نکو مہرؔ، غوث شریف عارفؔ، اساتذہ کا سلسلہ تلمذ، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اس شوق میں ان کا مطالعہ کیا کہ دیکھیں اس میں میرے بزرگوں کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ لیکن حیرت اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ رام گنج بازار کے دیگر شعراء کا ذکر تو ان مقالوں میں کروا دیا گیا۔ ذکر نہیں کروایا تو رام گنج بازار کے رضی الدین رضا کا ذکر نہیں کروایا جو آگاہ دہلویؔ (تلمیذ غالبؔ) اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ جے پور کا ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ رضا کے تعلقات صبؔا اور مہرؔ سے کس قدر گہرے تھے۔ ان حضرات نے کتنے ہی مشاعرے رضا صاحب کے دواخانہ پر پڑھے ہیں۔ اپنے بزرگوں کا ذکر نہ دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اور احساس ہوا کہ یہ تو جے پور کے ادب سے میرے بزرگوں کا نام مٹا دینے کی سازش ہے۔ اس بات نے میرے جذبات کو بیدار کیا۔ حالانکہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ نہ مجھے تحریر لکھنا آتا ہے اور نہ مقفع و مسجع عبارت بنانی آتی ہے۔ نہ مجھے الفاظ سے کھیلنا آتا ہے۔ نہ زور قلم رکھتا ہوں نہ مجھ میں چالاکی ہے۔ اور مجھے اپنی ان خامیوں کی پرواہ بھی نہیں ہے۔ میں جس مقصد کے لئے سامنے آیا تھا خدا نے مجھے اس میں کامیاب کر دیا۔ اب تو یہ میرا مشن بن گیا ہے کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد جس شخص کے ساتھ بھی جے پور میں تعصب برتا گیا اور اس کی تخلیقات کو سامنے آنے سے روکا گیا، اس کی مدد کروں۔ کسی کو غیر معیاری کہہ دینے سے وہ غیر معیاری نہیں ہو جائیگا۔ سنگ اسود کو لاکھ کوئی پتھر ہی کہتا پھرے، پتھر کہنے سے اس کی تاریخی اہمیت کم نہیں ہو جائیگی۔ غالب اسکول کے ایک شاعر انجم جے پوری کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ اور براہ کرم انصاف کریں کہ یہ معیاری شاعری ہے یا نہیں۔

برہمی ہو کہ التفات کے رخ
ہم سمجھتے ہیں حادثات کے رخ
قلب کی دھڑکنیں خدا کی پناہ
اللہ اللہ غم حیات کے رخ
ہے خرد کو مشاہدہ سے گریز
ہم نے دیکھے ہیں دن میں رات کے رخ
انھیں مت چھیڑ یہ پریشاں لوگ
پھیر دیتے ہیں کائنات کے رخ
انھیں آواز دو ذرا انجم
جو سمجھتے ہیں اپنی بات کے رخ

آپ ہی بتائیں کیا یہ غیر معیاری شاعری ہے۔تو پھر معیاری شاعری کیا ہوتی ہے۔اس طرح ہر کسی کو غیر معیاری کہہ کر ادب سے خارج کرنا کہاں کا انصاف ہے۔غالب اسکول کے ایسے کئی شعرا کے ساتھ یہی سلوک ہوا ہے۔اس کی تفصیل آپ کو میری مرتبہ کتاب ''غالب اور راجستھان'' میں نظر آئیگی۔

میرے پاس کئی شعرا کے قلمی دیوان موجود ہیں،ان کو میں ایک ایک کر کے شائع کر رہا ہوں۔یہ دیوان مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں کیونکہ ان کا تعلق جے پور سے ہے۔کیا میں غیر معیاری کہہ کر ان کے دیوان پھینک دوں۔اگر میں ایسا کروں گا تو یہ ادب کے ساتھ کھلواڑ ہوگا۔مالک رام صاحب نے راقم دہلوی کے بارے میں تبصرہ کیا تھا کہ ان کے کلام میں نیا پن نہیں ہے۔یہ اعلیٰ تنقید ہے اور ہر خاص و عام کو قبول ہوگی۔لیکن کوئی بھی تذکرہ نویس کسی شاعر کو اپنی مرضی سے غیر معیاری کہہ کر ادب سے خارج نہیں کر سکتا۔

جے پور کا ہر ادبی شخص جانتا ہے کہ چاند نرائن نکو مہر کو ان کی شراب نوشی نے نہ صرف صاحب فراش بلکہ تنگ دست بھی کر دیا تھا۔میرے والد حافظ منظور ادیب برسوں

مہر کا کھانا اپنے گھر سے لے کر جاتے رہے اور ان کی پرسش کرتے رہے۔ مہر نے اپنے یہاں ایک بندریا بھی پالی ہوئی تھی۔ ادیب صاحب اس کے کھانے کا بھی انتظام کرتے تھے۔ اب ایسا خلوص محبت شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ چاند بہاری لال صبا روزانہ میرے تایا رضی صاحب کے یہاں آیا کرتے تھے۔ ان کا ذکر خداداد مونس صاحب نے اپنے مضامین میں بھی کیا ہے۔ اور راہی شہابی نے اپنی کتاب سمن زار سخن میں لکھا ہے۔

سوال ۶۔ آپ نے سب سے پہلے کس موضوع پر قلم اٹھایا۔ کیا کیا لکھا اور کہاں چھپا۔

جواب۔ بی اے کی تعلیم کے دوران لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چند افسانہ لکھ ڈالے۔ لیکن والد کے ڈر سے نہ تو کسی کو دکھائے اور نہ کہیں شائع ہونے کے لئے بھیجے۔ ان ہی افسانوں کا مجموعہ ابھی حال ہی میں ''کیا خوب آدمی تھا'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

سوال ۔ ۷۔ سب سے پہلے آپ کی کون سی کتاب منظر علم پر آئی۔ اس کے مواد و متن کے تعلق سے مفصل روشنی ڈالیں۔

جواب۔ ابتدا میں، میں نے صوفیا کی تعلیمات سے اپنا کام شروع کیا۔ میرے پاس ایک بہت ہی کہنہ رسالہ تھا۔ اس کے چند منتخب اقتباسات کو ''سرمایہ مساکین'' کے نام سے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا۔ اس رسالہ میں سبھی سلسلوں کے صوفیا کی تعلیمات اور ان کی عملی زندگی کی حکایتیں ہیں۔ اسی سال 'جے پور کے اولیا' نام سے ایک سیریز شروع کی جو چار حصوں پر مشتمل تھی۔ یہ چھوٹے چھوٹے رسالے بے حد پسند کئے گئے۔ مجھے ان کے اور بھی ایڈیشن شائع کرنے پڑے۔ اسی سال مقام اولیا، مسجد کا احترام کیجئے، آپ کس حال میں ہیں ،قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں وغیرہ کے نام سے کئی چھوٹے کتابچے بھی شائع کئے۔ یہ سبھی تعلیمات صوفیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی کام کو بڑے پیمانہ پر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ تو دو سال کی محنت سے تذکرہ اولیا راجستھان مرتب کر ڈالی۔ اس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کام راجستھان میں پہلی بار ہوا ہے۔ جیسلمیر سے لیکر بھرتپور تک ،اور شیخاواٹی سے لیکر جھالاواڑ تک سینکڑوں صوفیا کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوال ۔۸۔ راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی کے بنیاد گزار کون ہیں۔ اگر یہ ادارہ آپ ہی نے قائم کیا ہے تو اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں۔

جواب ۔ یہ اکیڈمی میرے عزیز ترین دوست جناب شکیل الرحمٰن اور میری ذاتی کاوشات کا نتیجہ ہے۔ ہم بہت عرصہ سے محسوس کر رہے تھے کہ راجستھان کی تحقیقات میں جانب داری سے کام لیا جا رہا ہے۔ کیوں نہ ہم ایسا کام شروع کریں جس سے نئے مشاہیر کی خدمات بھی اجاگر ہوں اور نئی تحقیقات بھی سامنے آئیں۔ یہی سوچ کر ہم نے اس کی شروعات کی۔ اور الحمد اللہ ہم نے بہت کچھ کر دکھایا۔ جے پور میں اردو افسانہ اور لالہ سری رام کی ادبی خدمات پر سیمینار منعقد کرا چکے ہیں۔

جہاں تک اغراض و مقاصد کا سوال ہے وہ یہ ہیں۔ اردو ریسرچ اسکالرز کی مدد کرنا۔ راجستھان میں قدیم مخطوطوں کی تلاش۔ راجستھان کے ان مشاہیر کو سامنے لانا جنھوں نے اردو ادب میں نمایاں کارنامے انجام دیئے لیکن وہ بے اعتنائی کا شکار ہوئے۔ اسکالرز کے لئے مقالہ پڑھنے کے مواقع فراہم کرنا۔ ایک کتب خانہ قائم کرنا۔ سال میں ایک بار کسی موضوع پر سیمینار کرنا۔ ادبی تحقیق جاری رکھنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل ابھی ہم نے اکیڈمی کے لئے کوئی با قاعدہ فنڈ قائم نہیں کیا ہے۔ ہم دونوں ہی تمام اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ چونکہ ہم دونوں ہی میں خود داری بھری ہے۔ اس لئے ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم نے اکیڈمی کے سلسلے میں کسی سے مالی امداد لی تو وہ پروگرام میں اپنی دخل اندازی دکھائے گا جو ہمیں قبول نہیں ہوگی۔ اس لئے ہم کوشش کرتے ہیں کہ جس قدر رقم ہمارے پاس موجود ہے اسی میں کام چل جائے۔

سوال ۔۹۔ مذکورہ ادارے کے تحت اب تک آپ ہی کی مرتب کردہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ کیا آپ مستقبل میں کسی دوسرے محقق یا ناقد کی کوئی کتاب شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

جواب ۔ یہ بہت اچھا سوال آپ نے کیا ہے۔ دیکھئے راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی اس غرض

سے قائم کی گئی ہے کہ راجستھان میں اردو تحقیقات کو فروغ دیا جائے۔ادب کے گم شدہ گو شوں کی اشاعت کر کے سامنے لایا جائے۔ہم ابھی تک یہی سب کچھ کرتے آرہے ہیں۔لیکن مستقبل میں اگر کسی محقق یا ناقد کی کوئی کتاب شائع کرنے کا موقع آیا تو اس پر بھی غور کیا جائے گا۔ہم نے قسم تو نہیں کھائی ہے کہ کسی اور محقق کی کتاب شائع نہیں کرینگے۔ویسے پچھلے سال ہم ڈاکٹر عثمانی صاحب کی ایک کتاب کہانی تاریخی چبوترے کی شائع کر چکے ہیں۔مقامی طور پر کچھ شعرا نے اپنا مجموعہ کلام شائع کرنے کے بابت ہم سے رجوع کیا تھا۔لیکن ہم نے صرف شعرا کا کلام شائع کرنے میں معذوری ظاہر کی کیونکہ اس کام کے لئے تو اردو اکیڈمی ہی بہتر ثابت ہوتی ہے۔جب کہ ہماری دلچسپی تحقیق میں ہے۔

سوال۔۱۰۔آپ کے اشاعتی ادارے کی جانب سے اب تک کتنی اور کون کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔کیا تحقیق کے علاوہ تخلیقی ادب سے متعلق بھی کوئی اشاعتی منصوبہ آپ کے پیش نظر ہے۔

جواب۔میری مندرجہ ذیل تحقیقی کتب اب تک اس اکیڈمی سے شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ چند شاعرات راجستھان اور کچھ بھولے بسرے شعر ا(تحقیق)

۲۔ خم خانہ جاوید میں راجستھان کے شعرا (تحقیق)

۳۔ پرواز بے پر۔جے پور کا پہلا مطبوعہ مزاحیہ کلام (تحقیق)

۴۔ ستار جے پوری شخصیت اور فن (تحقیق)

۵۔ خانوادہ سید نجف علی خاں کی راجستھان میں سو سالہ علمی وادبی خدمات

۶۔ راجستھان کی خواتین نثر نگار (تحقیق)

۷۔ ریاست جے پور میں بیرونی شعرا کی شعری خدمات (تحقیق)

۸۔ راجپوتانہ میں اردو، ریختہ اور دوہے (تحقیق)

۹۔ کنور یسین علی خاں شہاب اور ان کی تخلیقات (تحقیق)

۱۰۔ قیسی رامپوری۔ایک تعارف (تحقیق)

۱۱۔ راجستھان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین (پہلی جلد) (تحقیق)

۱۲۔ مشاہیر ادب راجستھان (تحقیق)

۱۳۔ غالب اور راجستھان۔ (سلسلہ غالب)

یہ سب وہ موضوعات ہیں جن پر ابھی تک کسی نے بھی قلم نہیں اٹھایا تھا۔ ان کے علاوہ تصوف پر بھی میں نے کتابیں مرتب کی ہیں۔

۱۴۔ تذکرہ اولیا راجستھان (جلد)

۱۵۔ تذکرہ اولیا راجستھان (دوسری جلد)

۱۶۔ تذکرہ اولیا راجستھان (تیسری جلد)

۱۷۔ انوار الجمال فی تذکرۃ الجمال (جے پور میں سلسلہ جمالیہ کا فروغ)

۱۸۔ حکمران جے پور اور مسلم صوفیا۔ سیاسی نقطہ نظر سے (تحقیق)

۱۹۔ شاہ ولایت جے پور: مولانا ضیاء الدین

۲۰۔ سرمایہ مساکین

۲۱۔ تذکرہ شاہ مدار

ذیل میں تخلیقی ادب کے وہ مجموعے ہیں جو میں اکیڈمی سے شائع کر چکا ہوں۔

۲۲۔ رہ گزر۔ افسانوں کا مجموعہ (مختار الرحمٰن راہی)

۲۳۔ بولتے پربت۔ افسانوں اور ڈراموں کا مجموعہ (ستار جے پوری)

۲۴۔ احمر جے پوری۔ سوانح اور شخصیت

۲۵۔ کیا خوب آدمی تھا۔ (افسانے۔ شاہد احمد جمالی)

۲۶۔ انتخاب کلام شاہد

۲۷۔ راجستھان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین، جلد دوم

۲۸۔ قدم قدم منزل۔ افسانے (مختار الرحمٰن راہی)

۲۹۔ انتخاب کلام ناظم عزیزی

۳۰۔ جے پور میں فن تاریخ گوئی کی ایک روایت

۳۱۔ گلزار ادیب

۳۲۔ منتخب نعتیہ کلام

۳۳۔ مختار الرحمٰن راہی۔ شخصیت اور فن

۳۴۔ گلشن ستار۔ ستر جے پوری کا شعری مجموعہ

زیرِ ترتیب کتب:

۳۵۔ آزادی کے بعد راجستھان کا پہلا محقق، سلیم جعفر

۳۶۔ آزادی کے بعد جے پور میں غلط روایات کا فروغ

۳۷۔ جے پور میں ''اردو ڈرامہ''، ریڈیائی ڈراموں تک

۳۸۔ جے پور کی پہلی ادبی انجمن ''سوشل سائنس کانگریس''

۳۹۔ تذکرہ شعراءِ جے پور کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

۴۰۔ عبدالقادر ماہر جے پوری کے قلمی دیوان (۱۹۳۵ء) کی تدوین

۴۱۔ مفتوں کوٹوی۔ ایک بے نیاز محقق

۴۲۔ سلیم جعفر کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ

اکیڈمی کے ذریعہ ہم تحقیقی اور تخلیقی ادب کو ہی فوقیت دیتے آ رہے ہیں۔ حال ہی میں اکیڈمی نے ایک پروجیکٹ کا لائحہ عمل تیار کیا ہے۔ جس کا نام ''تذکرہ شعرا جے پور ۱۹۶۰ء تا حال'' تجویز کیا ہے۔ راجستھان یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر عبدالمنان خان سے اس سلسلے میں ذمہ داری لینے کی بات کی جا رہی ہے۔ لیکن سارا کام تو مجھے ہی کرنا ہوگا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اس کام میں کم و بیش دو سال کا عرصہ لگ جائے گا۔

یہاں ایک بات کہنے کا مجھے حق بنتا ہے۔ مندرجہ بالا فہرست میں صرف دو کتابیں ''پرواز بے پر'' اور ''گلزار ادیب'' میرے بزرگوں پر لکھی گئی ہیں۔ بقیہ چالیس کتب ان مشاہیر پر مرتب کی گئی ہیں یا مرتب کی جا رہی ہیں جن سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں

ہے۔لیکن یہ سبھی حضرات راجستھان کے وہ مشاہیر ہیں جن کی خدمات کے ذکر کے بغیر راجستھان کی ادبی تاریخ مکمل نہیں ہو گی۔ مجھے صرف اپنے خاندان کے بزرگوں پر قصیدے پڑھنا نہیں آتا۔ جومزہ دوسروں کے کام آنے میں ہے وہ خودستائشی میں نہیں ہے۔راجستھان کے مشاہیر کی تخلیقات کوسامنے لانا میرا ذوق وشوق ہے۔

سوال ۔۱۱۔راجستھان کے پہلے محقق تو حافظ محمود شیرانی ہی کوتسلیم کیا جائے گا۔یہ الگ بات ہے کہ موصوف نے راجستھان سے دوررہ کراپنے گرانقدر کارنامے انجام دئے،اس سلسلے میں آپ کی کیارائے ہے۔

جواب ۔ بلاشبہ حافظ محمود شیرانی راجستھان کے پہلے محقق ہیں اور رہیں گے۔ہمیں فخر ہے کہ محمود شیرانی راجستھان سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ ہندوستان کے کسی بھی کونے میں رہے ہوں وہ ہر حال میں اس صوبہ کے پہلے محقق بنے رہینگے۔آپ بھی تو کئی سالوں سے پونہ میں ہیں لیکن فتح پور آپ کے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے،کیوں؟ کیونکہ آپ ملک کے کسی شہر میں رہیں آپ فتح پور کے ہی کہلائینگے۔ میں نہایت ایمان داری سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں کچھ حضرات ایسے موجود ہیں جو یہ کہتے آرہے ہیں کہ راجستھان کے متعلق شیرانی کی تحقیقات بہت کم ہیں،جب کہ تمام بنیادی تحقیقات محمود شیرانی کے نام ہیں۔

شیرانی نے ہی سب سے پہلے تاریخ غریبی کوتلاش کیا۔انھوں نے ہیں مہدویہ فرقے کی تصنیف وتالیفات اوران کے رہن سہن کی تفصیل سے نشاندہی کی۔انھوں نے ہی مدلل یہ ثابت کیا کہ جو دیوان عقیدت کی آڑ میں خواجہ معین الدینؒ کے نام منسوب کردیا گیا ہے وہ دیوان ان کا نہیں ہے۔اسی طرح پرتھوی راج راسا کا مکمل پوسٹ مارٹم کر کے اس کی تاریخی حیثیت پر سوال کھڑا کر دیا ہے۔راجستھان کے سلسلے میں محمود شیرانی کی اور بھی بہت سی تحقیقات ہیں۔افسوس ہے کہ راجستھان میں آزادی کے بعد شیرانی پر بڑے پیمانے پرابھی تک کام نہیں ہوا۔

سوال ۔۱۲۔ میرا خیال ہے راجستھان میں حافظ محمود شیرانی اوران کے فرزند شاعر رومان

اختر شیرانی کی وہ قدر افزائی نہیں ہوئی جس کے دونوں باپ بیٹے مستحق ہیں۔

جواب۔ آپنے صحیح فرمایا۔ میں بھی تو یہی عرض کرر ہا ہوں۔ یہ دونوں حضرات جس مرتبہ اور مقام کے حقدار ہیں، وہ ان کو نہیں ملا ہے۔ صرف پی ایچ ڈی کروا کر صبر کر لیا گیا۔ جب کہ دونوں حضرات کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو ابھی باقی ہیں جن پر کافی گفتگو کی گنجائش ہے۔ اختر شیرانی کا بہت سا کلام ایسا ہے جو ان کے مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ اختر شیرانی کی نثر پر بھی بہت کام باقی ہے۔ اصل میں یہ کام راجستھان اردو اکیڈمی کو کرنا چاہئے، لیکن بدقسمتی سے کئی سالوں سے اکیڈمی اپنا وجود کھوئے ہوئے ہے۔ اکیڈمی بڑے پیمانہ پر اس کام کو انجام دے سکتی ہے۔ اکیڈمی نے صرف اتنا کیا ہے کہ ان دونوں مشاہیر کے نام سے انعام رکھ دیا ہے۔ الحمد اللہ، اس خاکسار نے دونوں حضرات کا ایسا مواد جمع کر رکھا ہے جو عام طور سے ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا۔ لیکن اس کو ترتیب دینے میں ابھی وقت لگے گا۔

سوال ۔۱۳۔ کیا مقامی طور پر آپ کی کتابوں کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یا تجاہل عارفانہ کے تحت آپ کے ادبی کارناموں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

جواب ۔ میرے ساتھ دونوں ہی واقعات ہوئے ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ ایک بڑے طبقہ نے میری کاوشات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا بھی ہے اور دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔ اور مستقبل میں بھی امید ہے کہ وہ اسی طرح میری کاوشات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ راجستھان کے ریسرچ اسکالرز میری کتابوں سے استفادہ حاصل کرر ہے ہیں۔ لیکن کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو ظاہر میں تو میری کوششوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن دل میں مخالفت کا مادہ رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر اسی سال مارچ کی بات ہے کہ ٹونک کے اے پی آر آئی میں تین روزہ سیمینار منعقد ہوا تھا، جس میں ہندوستان کے کئی مشہور حضرات نے شرکت کی تھی۔ اس سیمینار میں آپ بھی تو تشریف لائے تھے اور آپ کو بھی وہاں اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ میرے ساتھ میرا بھانجہ اور راجستھان یونیورسٹی کا ایک ریسرچ

اسکالراور چند طالبات کے علاوہ دیگر لوگ بھی تھے۔ پہلے سیشن کے بعد وقفہ کے دوران میری ملاقات پہلی بار ہندوستان کی ایک مشہور ومعروف ادبی شخصیت سے ہوئی تھی۔ میں ان سے مصروف گفتگو تھا کہ اتنے میں راجستھان کے ایک مشہور شخص قریب آ گئے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ جناب میں ان سے مل چکا ہوں، آپ بھی میری سفارش فرما دیں۔ پتہ نہیں ان صاحب کو میرا یہ کہنا برا لگا یا ان کے دل میں کچھ اور تھا، انھوں نے تضحیک آمیز لہجہ میں فرمایا کہ ہاں، ہاں صاحب، انھوں نے کام کیا ہے، لیکن ان کی کتابیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کچھ کہا جائے یا لکھا جائے۔'' میں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے۔ اس طرح سب کے سامنے میری جو بے عزتی ہوئی اس کی کسک آج تک میرے دل میں ہے۔ میں ایمانیہ کہتا ہوں کہ کئی راتوں تک مجھے نیند نہیں آئی۔ جب کہ خدا گواہ ہے کہ میں ان صاحب کو دل میں پوجتا تھا۔ ان کو اپنا آئیڈیل مانتا تھا۔ اور ان کی اتنی عزت کرتا تھا کہ جب کبھی کوئی میرے سامنے ان کی شان میں کچھ کہتا تو میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ لیکن افسوس کہ انھوں نے میرے ساتھ ایسا کیا۔ اس پر سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ جب دوسرے دن، ان صاحب سے اس بابت کہا گیا تو صاف منع کر دیا کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ یعنی ہم چار آدمی ان کے الفاظ کو سننے والے موجود ہیں، لیکن وہ اپنی کہی ہوئی بات کا اعتراف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ان صاحب کی نظر میں، میں کتنا ہی حقیر اور بے حقیقت سہی لیکن ان کو قطعی یہ حق نہیں پہنچتا کہ سب کے سامنے مجھے اس طرح ذلیل کریں۔ اس تجربہ نے میری روح کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے میرے اندر باغیانہ خیالات پیدا ہو گئے۔ خدا مجھے ہدایت دے۔ اگر وہ صاحب خوش دلی سے اعتراف کر لیتے تو شاید میرے زخم پر مرہم لگ جاتا۔ بہر حال میں اس کو ایک برا خواب سمجھ کر بھول جانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سوال۔۱۴۔ آزادی کے بعد راجستھان میں تحقیق کا کام جے پور ہی سے شروع ہوا ہے۔ اس سلسلے میں آپ آزادی کے بعد راجستھان میں اردو کے حوالے سے پہلا محقق

کے تسلیم کرتے ہیں۔

جواب ۔ یہ بہت اہم سوال ہے۔اور میں اس سلسلے میں بغیر کسی شبہ کے سلیم جعفر کا نام لونگا۔۱۹۵۱ء میں سلیم جعفر نے ''گلزار نظیر'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب نظیر اکبر آبادی پر تصنیف کی۔۵۴۰ر صفحات کی یہ کتاب، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔انھوں نے نہ صرف نظیر کے کلام کی تدوین کی بلکہ نظیر کے استعمال کئے گئے ہندی الفاظ کی فرہنگ بھی تیار کی۔اور یہ بھی بتایا کہ کون سا لفظ دوسرے شاعر نے بھی استعمال کیا ہے۔ جو تشنگی ڈاکٹر شہباز کی تحقیقات میں رہ گئی تھی، وہ سلیم جعفر نے پوری کر دی۔ سلیم جعفر نے اس سلسلے میں بھی سیر حاصل بحث کی ہے کہ نظیر اکبر آبادی کو نظیر دہلوی کیوں نہ کہا جائے۔ میرے پاس یہ کتاب موجود ہے۔۱۹۵۱ء میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد سلیم جعفر ۱۹۵۲ء میں ترک وطن کر گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ بلکہ اردو کے حوالہ سے یہ ملکی سطح پر کیا گیا ایک بڑا کام ہے۔ آزادی کے بعد راجستھان میں اردو کا سب سے پہلا تحقیقی کام یہی ہے۔ سلیم جعفر کے بیس پچیس سال بعد تک دور دور تک کوئی دوسرا صاحب تصنیف محقق سامنے نظر نہیں آتا۔ سلیم جعفر کی یہ تحقیق ہر طرح سے اہم اور معتبر اور اولین حیثیت رکھتی ہے۔ آزادی کے بعد راجستھان میں سب سے پہلے محقق سلیم جعفر ہی ہیں۔ دیگر محققین ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔اس سلسلے میں میری ایک کتاب بعنوان ''آزادی کے بعد راجستھان کا پہلا محقق'' جلد ہی آرہی ہے۔۔ایک اور کتاب سلیم جعفر کی دیگر تحقیقات اور تخلیقات پر ''کلیات سلیم جعفر'' کے نام سے مرتب کی جا رہی ہے۔ انشاءاللہ جلد ہی یہ کتابیں منظر عام پر آئیں گی۔

سوال ۔۱۵۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ''تحقیق ایک ایسی غزل ہے جس میں مقطع نہیں ہوتا''۔یعنی کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

جواب ۔ بیشک ۔آپ نے صحیح فرمایا۔ گیان چند جین، قاضی عبد الودود، وغیرہ نے اپنے اپنے الفاظ میں تحقیق کی تعریف بیان کی ہے لیکن جس شاعرانہ انداز میں آپ نے تحقیق کی

تعریف بیان کی ہے وہ مجھے بہت پسند آئی ہے۔جس طرح وقت کبھی نہیں تھمتا اسی طرح تحقیق کبھی جامد نہیں ہوتی۔لیکن ہمارے راجستھان میں تنگ دلی کا رواج روز بروز بڑھ رہا ہے۔اگر آپ نے کسی کی تحقیق سے آگے بڑھ کر کچھ اور نئی چیز تلاش کر لی ہے تو اس کو ہضم کر نے میں تامل کیا جاتا ہے۔کھلے دل سے قبول نہیں کیا جاتا۔عجیب عجیب تاویلیں دے کر اس کی اہمیت کو کم کر دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر ابھی تک جے پور میں اردو کے ابتدائی نقوش سنہ ۱۸۰۳ء سے بتائے جاتے رہے ہیں۔جب کہ اس خاکسار نے ۱۶۹۳ء کی بڑی روانی سے استعمال کی گئی اردو کی بہت مثالیں اپنی کتاب ''راجپوتانہ میں اردو، ریختہ اور دوہے'' میں درج کی ہیں۔ایک اور کتاب ''راجستھان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین۔۱۹۱۱ء تا ۱۹۵۴ء'' میں بھی کئی مثالیں لکھی ہیں۔لیکن کیا مجال کہ اس حقیر کی ذرا بھی پذیرائی کی گئی ہو۔ اس سلسلے میں خاموشی چھائی ہوئی ہے۔اسی طرح جے پور کی پہلی قومی شاعرہ 'شہزادی کلثوم' کا کلام تلاش کر کے منظر عام پر لایا، اسے شائع کیا۔اس کے آزادی کے نغمے اجاگر کئے۔مگر نتیجہ وہی۔ آزادی کے بعد راجستھان کی پہلی افسانہ نگار خاتون کو بھی خاکسار نے ہی پہلی بار ادب میں روشناس کرایا ہے۔راجستھان کے افسانوی ادب کی پہلی مطبوعہ داستان ''وقائع راجکمار۔۱۸۷۶ء'' کو تلاش کرنے والا یہی خاکسار ہے۔اس سے قبل ''جمیل'' نامی تخلیق کو راجستھان کے افسانوی ادب کی اولین تخلیق بتایا جاتا رہا ہے۔کیا مجال کہ ہمت افزائی کے لئے دو لفظ منھ سے نکالے گئے ہوں۔لیکن مجھے ان باتوں کی پرواہ بھی نہیں ہے۔اس سلسلے میں مجھے روز ہی نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ہو سکتا ہے مستقبل قریب میں راجستھان کے اردو ادب کے کچھ اور ''اولین'' نمونے دیکھنے کو ملیں۔

سوال۔۱۶۔راجستھان میں اب تک جو ''تحقیقی'' کارنامے انجام پا چکے ہیں، کیا آپ ان کے ماخذات، حوالوں اور نتائج سے پوری طرح اتفاق رکھتے ہیں۔

جواب۔راجستھان میں ۱۹۷۰ء سے تحقیقی مقالات لکھے جا رہے ہیں۔ڈاکٹر سید محمد علی

زیدی اور ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی کے نام سرفہرست ہیں۔ یونیورسٹی میں شعبہ اردو قائم ہونے کے بعد اردو میں تحقیقی مقالے لکھے جانے میں تیزی آئی۔ تب سے آج تک دیگر یونیورسٹیوں کے بھی مقالات شامل کیے جائیں تو ان کی تعداد سینکڑوں میں ہوگئی ہے۔ پچھلے پندرہ سالوں میں وہ مقالات جو راجستھان کی ادبی تحقیق سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سے چند شائع ہوکر منظر عام پر بھی آئے ہیں۔ یہ ایک اچھی علامت ہے کیونکہ ان کے موضوعات بہت اہم ہیں۔ لیکن اگر ایمانداری سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں کئی ایسے ہیں کہ ان کے ابتدائی سوڈیڑھ سوصفحات تک تو پتہ ہی نہیں چل پاتا کہ یہ مقالہ کے موضوع کے بارے میں ہیں یا زبردستی کسی غیر متعلق شخصیت کی تعریف وتوصیف کے بارے میں لکھائے گئے ہیں۔ ایسے کئی مقالے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ میری نظر سے گزرے ہیں جن کی زبان، انداز بیان، نام، مضمون، عبارت اور ماخذات، اور طرز تحریر یہاں تک کہ الفاظ میں بھی ذرا فرق نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سب مقالے مختلف سالوں میں مکمل ہونے کے باوجود ایک ہی وقت میں لکھے گئے۔ تحقیقی مقالوں کی یہ مماثلت سمجھ میں نہیں آتی۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ صرف چند مخصوص ماخذات کے علاوہ کوئی دوسرا ماخذ استعمال ہی نہیں کیا جاتا۔

اگر یہ تاویل دی جائے کہ صاحب دیگر کتابیں ہیں کہاں جن کو ماخذ بنایا جائے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ کتابیں تو بہت ہیں، ماخذات بھی بہت ہیں، آپ ان کو جگہ بھی تو دیں۔ یہ خاکسار بھی تو ان کتابوں کو ماخذ کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ میرے پاس یہ کتب کہاں سے آئیں؟۔ منفی نظریات اور تنگ دلی کا یہ حال ہے کہ آزادی کے بعد سب سے پہلے راجستھان کے شعرا کا مختصر تذکرہ سرور تونسوی، ایڈیٹر شان ہند، دہلی نے جون ۱۹۵۷ء میں ''راجستھان نمبر'' میں ''انجمن گل۔ تذکرہ شعرائے راجستھان'' کے نام سے سوصفحات میں شائع کیا تھا، اس کو صرف اپنی ضد کی وجہ سے پہلا تذکرہ نہیں مانا جاتا۔ صاف کہا جاتا ہے، بلکہ کتاب میں لکھ دیا جاتا ہے کہ اس کو ہم تذکرہ نہیں مانتے۔ جب کہ اس میں نو مختلف شہروں کے ستر سے زائد شعراء کا ذکر اور نمونہ کلام موجود ہے۔ سرور تونسوی نے ہی سب

سے پہلے اہل تحقیق کی توجہ اس جانب مبذول کروائی تھی۔اس تذکرہ میں قدیم اور جدید دونوں شعرا کا ذکر اور نمونہ کلام موجود ہے۔اس تذکرہ کو ماخذ کے طور پر استعمال ہونے نہیں دیا جاتا۔ بھلا بتایئے ،اپنی انا کی خاطر اس کو تذکرہ نہیں مانا جاتا۔ایسے نہ جانے کتنے ماخذات ہیں جن کو قطعی نظر انداز کیا جاتا ہے۔ یہ تو ظلم ہے۔

میں نے اس روایت کو توڑا ہے۔ بہت سے بالکل نئے ماخذ تلاش کئے ہیں۔اور کر رہا ہوں۔یہی وجہ ہے کہ آپ کو میری کتب میں ہر بار نیا مواد، نیا مضمون اور نئی چیزیں نئے ماخذات کے ساتھ ملیں گی۔اگر میں بھی ان مخصوص ماخذات کا ہی پابند رہتا ،تو قطعی آگے نہیں بڑھ پاتا۔بس ایک دائرے میں گھومتا رہتا۔میں اس سلسلے میں کچھ کوتاہی طلبا کی بھی مانتا ہوں کہ وہ خود سے کوشش ہی نہیں کرتے کہ اپنے موضوع کے لئے ماخذات کو تلاش کریں۔مجھ جیسا بوڑھا اور بیمار شخص ، جو ضیق النفس کا مریض ہے، ماخذ کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے تو طلبا تو بالکل نوجوان ہیں، باہمت ہیں۔ان کو تو کچھ پریشانی ہو ہی نہیں سکتی۔''غالب اور راجستھان'' اور'' ریاست جے پور میں بیرونی شعرا کی شعری خدمات'' دونوں کتابیں خاص جے پور شہر سے تعلق رکھتی ہیں۔اس خاکسار نے ان مخصوص ماخذات کا سہارا لئے بغیر، نئے ماخذات سے مرتب کیا ہے۔آپ ان کتابوں کو سرسری نظر سے بھی ملاحظہ فرمائینگے تو ضرور اعتراف کرینگے کہ ماخذات کی کمی نہیں ہے۔مجھے ان مخصوص ماخذات سے پرہیز نہیں ہے،اعتراض یہ ہے کہ اس انداز میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جیسے ان کے علاوہ دوسرے ماخذات ہی نہیں ہیں۔

سوال ۱۷۔ جے پور میں ادبی طور پر کن خاندانوں نے اردو ادب، تخلیق، تحقیق اور ترسیل کے سلسلے میں بنیادی کام کیا ہے۔

جواب۔ریاست جے پور کے مہاراجہ رام سنگھ ثانی (پیدائش۔۱۸۳۵ء) جن کا دور حکومت ۱۸۵۵ء سے ۱۸۸۰ء تک رہا، وہ ایک رحم دل اور ادب نواز راجہ کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں۔۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ان ہی کے دور میں رونما ہوا تھا۔چونکہ ہنگامہ غدر کا

سیدھے سیدھے کوئی تعلق اس علاقہ سے نہ تھا، اس لئے دہلی اور دیگر علاقوں سے ہجرت کر نے والے شرفاء اور ارباب علم وادب کے لئے ریاست جے پور کے ساتھ ساتھ راجستھان کی دوسری ریاستیں کسی جنت سے کم ثابت نہ ہوئیں۔ ہجرت کر کے آنے والوں کو یہاں کی ریاستوں میں نہ صرف پناہ ملی بلکہ ان کی خورد ونوش کا بھی حکمرانوں نے انتظام کیا۔

جے پور کے آزاد خالدی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں۔ ''مہاراجہ رام سنگھ نے دہلی کو اجڑتے اور وہاں کے شرفا کو بگڑتے دیکھا تھا۔ جو کوئی بھٹکتا ہوا جے پور آیا اسے آگے نہ بڑھنے دیا۔ نہ اپنے وطن لوٹنے دیا۔ اپنی ریاست کی حیثیت کے مطابق تنخواہ مقرر کردی اور یہیں رکھ لیا۔ سچ پوچھئے تو لکھنو اور دہلی اجڑ کر بہت سے شہر آباد ہوئے۔ ان میں کچھ سپوتوں کی بستی یہ ایک جے پور بھی ہے۔..........سبھی طرح کے پیشہ ور اور ہنر مند، رام سنگھ کے بچھے دستر خوان پر جمع ہو گئے۔''

('مرزا مائل دہلوی'۔ مضمون نگار، آزاد خالدی۔۱۹۴۳ء۔ مشمولہ، راجستھان کے منتخب تحقیقی وتنقیدی مضامین، ۱۹۱۱ء تا ۱۹۵۴ء۔ مرتبہ شاہد احمد جمالی۔ راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی۔ جے پور۔۲۰۶۱ء)

اسی طرح مولوی عبدالحق فرماتے ہیں۔ ''زوال سلطنت مغلیہ کے بعد ہزاروں خاندان یوپی اور اردو کے علاقوں سے آکر جے پور میں بس گئے تھے۔ اور غدر کے بعد شرفا اور عوام، شعرا اور صاحبان علم وفن نے یہاں آکر پناہ لی تھی۔ ان میں سے چند شعرا کے نام یہ ہیں، ظہیر، انور (شاگردان ذوق) مرزا آگاہ، خواجہ راقم (شاگرد غالب) مرزا مائل (شاگرد انور) اور شگفتہ لکھنوی، وغیرہ۔ ان بزرگوں کے قیام سے شعروشاعری کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ اور مشاعروں کے ذریعہ اردو زبان کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ علمی وادبی مشاغل کا اس قدر زور تھا کہ لوگ جے پور کو دوسرا دلی کہا کرتے تھے۔''

(جائزہ زبان اردو۔ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی۔۱۹۴۰ء۔ ص۔۱۳)

ان مہاجرین میں ایسے اردو داں حضرات بھی تھے جن کے خانوادوں نے کئی

پشتوں تک اردو شعروادب میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی تھے۔مولانا سید نجف علی خاں کا خانوادہ ایسا خانوادہ ہے جس نے لگا تار سو سال تک راجستھان میں اردو شعروادب کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔تاج العلما سید نجف علی خاں،ان کے صاحب زادے سید غضنفر علی خاں،ان کے صاحبزادگان سید نظیر حسن سخا اور سید امیر حسن سہا،ان کی ہمشیرہ صالحہ بیگم پروینؔ۔سبھی حضرات صاحب تصنیف ہیں۔ پروین کو تو راجستھان کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

میر قربان علی کا خانوادہ،ان کی بھی چار پشتوں میں اردو تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا۔اسی طرح سلیم الدین تسلیم نارنولی کے خانوادے کا نام بھی قابل ذکر ہے۔اس خانوادے میں آج بھی تصنیف وتالیف کا کام جاری ہے۔ان کے علاوہ صوفیا حضرات کے خاندانوں نے بھی اردو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔جیسے مولانا شاہ محمد ہدایت علی،جن کے نام سے جے پور میں جامعہ ہدایت قائم ہے،ان کے صاحبزادے مولوی عبد الرحیم اوران کے صاحبزادے مولوی فضل الرحیم۔

خواجہ نجم الدین پروانہ (۱۸۱۹ء۔۱۸۷۰ء۔علاقہ شیخا واٹی)۔ان کے خاندان میں آج بھی اردو تصنیف وتالیف کا کام جاری ہے۔ایک اور اہم نام منشی محمد ایوب خاں فضاؔ کے خاندان کا ہے جن کے ذکر کے بغیر جے پور کی ادبی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔فضا اور ان کے صاحبزادے خدا داد مونسؔ سے اور ان کی ادبی خدمات سے کون شخص واقف نہیں ہے۔مونس صاحب پر تو تحقیقی مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔

کچھ اور اہم نام جو اس وقت یاد آ رہے ہیں وہ یہ ہیں۔انور علی شاد اور ان کے بیٹے خورشید علی مہر۔مولانا رزیؔ اور ان کے بیٹے الیاس عشقی۔مولانا شاکر حسین نقوی اور ان کے بیٹے طاہر حسین نقوی۔شاکر حسین نقوی نے ''محیط التواریخ'' کے نام سے راجپوتانہ میں سب سے ضخیم تاریخ لکھی جو کم وبیش بیس طویل جلدوں پر مشتمل ہے۔لیکن غیر مطبوعہ ہے۔صاحبزادہ احمد علی رونق اور ان کے صاحبزادے ولی احمد۔اکبر حسین اکبرؔ

جے پوری اوران کی ہم شیرہ شہزادی کلثوم۔شہاب برنی اوران کے صاحبزادے راہی شہابی وغیرہ وغیرہ۔

غیر مسلم خاندانوں میں پنڈت رام نرائن مضطؔران کے بیٹے شیام نرائن عاشق اور ان کے بیٹے چاندنرائن نکومہؔر کے نام نمایاں ہیں۔اس کے علاوہ منشی گوبند نرائن اوران کے بیٹے چند بہاری لال صبؔا شاگرد مائل دہلوی کے خاندان کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

آزادی کے بعد مولانا قمر واحدی، فضل الرحمٰن کیفؔی اور رضی الدین رضؔا کے خاندان کے نام لئے جا سکتے ہیں۔رضی الدین رضؔا کے بعدان کے برادرخرد حافظ منظوراحمد ادیؔب ،جن کواردو اکیڈمی نے ''اردورتن'' کا خطاب دیا تھا،اورادیؔب صاحب کا بیٹا یہ خاکسار'شاہد احمد جمالی' جواپنے بزرگوں کے بتائے طریق پر گامزن ہے۔علاوہ ازیں ڈاکٹر عثمانی صاحب کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔۱۹۷۰ء میں آپنے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔آپ کی کتب راجستھان کے ریسرچ اسکالرز کے لئے مشعل راہ بنی ہوئی ہیں۔آپ کی تحقیقات اس وجہ سے بھی اہم ہیں کہ اس زمانہ میں وسائل محدود تھے،آج جیسی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔عثمانی صاحب کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسین صاحب نے عمدہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسین،صدر شعبہ اردو ڈونگر کالج، بیکانیر،عثمانی صاحب کے بارے میں رقم طراز ہیں۔''راجستھان کے ادبی خدمت گزاروں میں ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی ممتاز مقام رکھتے ہیں۔آپ نے نہ صرف تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کے میدان میں گراں خدمات انجام دیں بلکہ نئی نسل کی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کیا۔راجستھان کے بیشتر اردو اساتذہ اور اسکالرز کسی نہ کسی طرح ان کے در دولت سے فیض یاب ہوئے ہیں۔''

(امعان وابتغا۔ڈاکٹر محمد حسین،گلوبل کمپیوٹرس، جے پور۔۲۰۶۱ء۔ص۔۲۱۲)

''راجستھان سے متعلق متعدد تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں جن پر ایم فل یا پی. ایچ. ڈی. کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ان میں سے کچھ تو شائع بھی ہو چکے ہیں۔

راجستھان سے متعلق تحقیقی کام کرنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے کسی نہ کسی طور پر عثمانی صاحب سے استفادہ نہ کیا ہو۔ عثمانی صاحب نے جن حقائق کی طرف اشارے کئے ہیں ان پر مزید تحقیق و تفتیش اور تنقید و تجزیہ کی ضرورت ہے۔'' (امعان وابتغا۔ ڈاکٹر محمد حسین۔ ص۔ ۲۱۷)

سوال۔ ۱۸۔ راجستھان میں اردو مدارس اور درس گاہوں کی صورت حال کیا ہے۔

جواب۔ مدارس تو سیاست کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کے بارے میں عجیب عجیب خبریں اور آرٹیکل آئے دن یہاں کے اخباروں کی سرخیاں بنتے ہیں۔ اگر صرف جے پور کی بات کریں تو یہاں کئی سرکاری، نیم سرکاری اور پرائیویٹ اسکول ایسے ہیں جو کافی عرصہ سے بارہویں تک اردو پابندی سے پڑھاتے آرہے ہیں۔ کچھ اسکولوں کا معیار بہت اچھا ہے اور کچھ کا سطحی ہے۔ اردو پڑھنے والے طلبا بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ چند اسکولوں کے نام جو اس وقت یاد آرہے ہیں وہ یہ ہیں۔ مسلم گرلز اسکول ۔مسلم بائز اسکول۔ مسلم اسکول آہنگران۔ اے اے وی اسکول وغیرہ۔ جامعہ ہدایت بھی ایک بہت معیاری اور ہائر ایجوکیشن کا ادارہ ہے۔ لیکن وہاں غریب طبقہ کا گزر نہیں ہے۔ راجستھان یونیورسٹی کے تحت بھی کئی کالجوں میں اردو موجود ہے۔ طلبا بھی کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی پتہ نہیں کیوں ایک بڑی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس پڑھانے والوں کے حاکمانہ اور غیر ہمدردانہ رویہ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

سوال۔ ۱۹۔ کیا تازہ کار ذہن کے مالک نوجوان ادب سے شغف رکھتے ہیں۔

جواب۔ جی ہاں، کیوں نہیں۔ اس وقت راجستھان میں کئی ایسے نوجوان سندی اسکالر موجود ہیں جو سرکاری درس گاہوں میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور اپنے تصنیف و تالیف کے کام میں بھی مشغول ہیں۔ جیسے ڈاکٹر حسین رضا، ڈاکٹر محمد حسین، ڈاکٹر رئیس احمد، ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن قادری، ڈاکٹر سید صادق علی، ڈاکٹر عزیز اللہ انصاری، ڈاکٹر اسما مسعود اور ڈاکٹر فرغانہ وغیرہ ایسے نام ہیں جن کی کئی تصنیفات طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کے علاوہ

کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جن کی اپنے تحقیقی مقالہ کے سوا کوئی دوسری تصنیف تو نہیں ہے لیکن کسی نہ کسی شکل میں ادبی سرگرمیوں میں ہمیشہ مشغول رہتے ہیں اور ادب کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

سوال۔۲۰۔ آپکی مرتبہ کتب کیا صرف راجستھانی حلقوں تک ہی محدود ہیں یا اردو کے دوسرے مراکز میں بھی آپ نے اپنی کتابیں پہنچائی ہیں۔

جواب۔الحمداللہ۔ میری مرتب کردہ کتب راجستھان کے باہر بھی ملک کے کئی شہروں تک پہنچی ہیں۔ جیسے امروہہ، رام پور، لکھنو، علی گڑھ، دہلی، ناسک، حیدرآباد، سولن، گونڈہ، ہگلی وغیرہ۔اس کے علاوہ بیرون ملک بھی گئی ہیں۔ میری ایک ویب سائٹ ہے جس کا نام ''جے پور کے اولیا'' ہے اس میں میں نے کئی کتابیں اپلوڈ کر رکھی ہیں۔ سبھی مفت ہیں۔ اکثر باہر سے میرے پاس فون آتے ہیں اور فون کرنے والے اپنی پسند اور رائے کا اظہار کرتے ہیں۔لندن کی 'برائٹ بک کمپنی' میں میری کتابیں فروخت ہو رہی ہیں۔ دہلی کے کئی بک سیلرز میری کتابیں منگواتے ہیں۔اس کے علاوہ این سی پی یو ایل نے میری کئی کتابیں خریدی ہیں۔

سوال۔۲۱۔ یہ سچ ہے کہ برسوں میں کوئی اتنا کام نہیں کرتا جتنا کام ایک قلیل مدت میں آپ نے کیا ہے۔ میں ذاتی طور پر آپ کے کارناموں کی قدر کرتا ہوں۔ میں چاہوں گا کہ آپ کی کتابیں دور دور تک پہنچیں، اس سلسلے میں آپ نے کیا لائحہ عمل مرتب کیا ہے۔

جواب۔آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں۔ دیکھئے، انسان کی اپنی کچھ طاقت و بساط نہیں ہوتی کہ وہ صرف اپنے ہی دم سے سب کچھ کر ڈالے۔ یہ سب اللہ کا کرم اور میرے والدین کی دعاؤں کا صدقہ ہے۔ جس کی وجہ سے میں یہ سب کر پایا۔اس کا کریڈٹ میں اپنی والدہ مرحومہ کو دیتا ہوں جنھوں نے یہ سارا سرمایہ سنبھال کر رکھا، ضائع نہ ہونے دیا۔ بزرگوں کے جمع کئے اسی سرمایہ سے ان جواہر پاروں کو نکال کر لایا ہوں۔ دراصل یہ میرے بزرگوں کا ایک خواب تھا جو پورا ہوا۔

میں کتابوں کے کاروبار سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی ابھی تک ان کتب سے روپیہ کمانے کا خیال آیا ہے۔میں زیادہ تر قدر دان حضرات کو اپنی کتب تحفتاً پیش کرتا ہوں۔اس سلسلے میں ابھی کوئی واضح لائحہ عمل میرے ذہن میں نہیں ہے۔کیونکہ میں اپنے تحقیقی مقالہ کی تکمیل میں مصروف ہوں۔اس مقالے کو یونیورسٹی میں جمع کرنے کے بعد ہی اس جانب توجہ دے سکونگا۔اگر آپ اس سلسلے میں مجھے کوئی مشورہ دیں تو اس پر ضرور غور کروں گا۔ویسے خدا کا کرم ہے کہ میری کتابوں کی شہرت اور اہمیت کی وجہ سے دہلی سے کئی بک سیلرز مجھ سے کتابیں منگواتے رہتے ہیں۔

سوال۔۲۲۔ادب سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے فرائض بھی ہیں۔آپ ان دونوں فرائض کے ساتھ کس طرح انصاف کرتے ہیں۔

جواب۔آپ نے بہت عمدہ بات فرمائی ہے۔بزرگ کہا کرتے ہیں کہ ایک وقت میں دو کشتیوں پر سوار نہیں ہوا جاتا۔شروع میں، میں نے یہی حرکت کی اور اندھے منھ گر گیا۔اللہ بخشش فرمائے، میری والدہ نے مجھے اس سلسلے میں تنبیہہ کی۔گھریلو ذمہ داریوں، کاروبار کی مصروفیات اور شوق کے درمیان فرق کو سمجھایا۔چنانچہ میں نے ان کے کہے مطابق اوقات کو تقسیم کیا۔اس کے بعد مجھے پھر کسی الجھن کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔والدہ کے قول کو میں نے مقدم رکھا کہ حقوق العباد پہلے اور سب بعد میں۔اب حال یہ ہے کہ میرے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے میرے اہل خانہ آگے سے آگے میرے لئے سہولت فراہم کرتے ہیں۔

سوال۔۲۳۔میں خود چھوٹے بڑے کا قائل نہیں۔میری نظر میں بڑا وہ ہے جو ڈگر سے ہٹ کر کچھ کام کر رہا ہے۔راجستھان میں آج بھی اردو کے جاں نثاروں کی کمی نہیں۔کیا آپ میری بات سے متفق ہیں۔اور ہیں تو کیوں۔

جواب۔میں آپ کی بات سے پوری طرح متفق ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ اس صوبہ کے کئی نوجوان اردو کے لئے بہت کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔لیکن جناب صحیح معنوں میں حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ہمارے مذہب میں ہے کہ کسی کو صحیح راہ بتانا بھی

عبادت ہے لیکن یہاں تو پہلی منزل پر ہی بھٹکا دیا جاتا ہے۔ میں آپ سے عرض کروں کہ یہاں بڑے بڑے مگر مچھ پڑے ہوئے ہیں۔ جو مچھلی بڑی ہونے لگتی ہے اس کو نگلنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یا تو وہ مچھلی ان مگرمچھوں کی چھتر چھایا میں ان کی ماتحت بن کر رہے یا ان کا لقمہ بن جائے۔ اگر کسی نے کوئی بڑا پروگرام منعقد کیا اور کسی کو بلایا کسی کو نہ بلایا تو سمجھو اس کی شامت آ گئی۔ ہمارے صوبہ میں ادبی گروپ بندی خطرناک صورت حال اختیار کر چکی ہے۔ ایسے حالات میں بے چارے اردو کے جانثار کیا کر سکتے ہیں، بس اپنی بساط کے مطابق کام کرتے رہتے ہیں۔

یہ خاکسار بھی اس تجربہ سے گزر چکا ہے۔ لیکن اب میں نے اپنا ایک طریقہ کار متعین کر لیا ہے۔ مجھ پر گزرنے والے اس واقعہ کے بعد اب مجھے کسی کی پرواہ بھی نہیں ہے۔ نہ مجھے کسی کی ناراضگی کا ڈر ہے۔ نہ اس کی فکر ہے کہ ادبی حلقوں میں میرے خلاف غلط پروپیکینڈہ چلایا جائے گا۔ میں خاموشی سے اپنا کام کرتا رہوں گا۔ اور میرا کام بس یہ ہے کہ راجستھان میں اردو ادب کے گم شدہ جواہر پارے تلاش کرتا رہوں اور ان کو منظر عام پر لاتا رہوں۔ میں ان میں سے نہیں ہوں کہ خود نے ہی کتاب لکھی اور خود نے ہی اس کتاب کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آمیز تبصرہ لکھا اور اپنے دوست کے نام سے کہیں بھی چھپوا دیا۔ نہ ان میں سے ہوں کہ ایک کتاب کا دس دس مرتبہ اجرا کراؤں۔

سوال۔۲۴۔ میرا پچاس سالہ تجربہ ہے اردو دنیا میں تعاون کا جذبہ رکھنے والوں کی کمی ہے۔ لیکن حوصلہ شکن تعداد میں زیادہ ہیں۔ سنجیدہ کاموں کو بھی مذاق اور استہزہ میں اڑا دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کا تجربہ کیا ہے۔

جواب۔ آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔ میں بھی تو یہی عرض کر رہا ہوں۔ بلکہ میں اس بات کو اس طرح کہنا چاہونگا کہ اب تو تعاون کرنے والے کا بھی یہ حال ہے کہ جب تک اس کا مفاد تعاون کرنے میں پوشیدہ ہے وہ تعاون کریگا اور جہاں اس نے دیکھا کہ اب تعاون کر نے میں میرا کچھ بھلا نہیں ہے وہ دامن بچانا شروع کر دیگا۔ جو کچھ تعاون اس نے کر دیا ہے

زندگی بھر اس کو احسان بتا کر جتا تا رہے گا۔ اور سب کے سامنے کہے گا کہ اس کو میں نے ہی تو آگے بڑھایا ہے، میں نے ہی تو اس کو مقام دلایا ہے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ اور غلطی سے اگر آپ کوئی اچھا سا پروجیکٹ بنا کر تعاون حاصل کرنے (تعاون سے میرا مطلب صرف رہنمائی ہے) کی امید سے مشورہ کرنے چلے گئے تو یہ طے ہے کہ آپ کو بھٹکا دیا جائے گا۔

مثال کے طور پر ہم نے اپنی اکیڈمی کے ذریعہ یہ پلاننگ کی تھی کہ راجستھان کے ہر شہر سے وہاں کے اردو ادب پر الگ الگ موضوعات پر دس مقالے، ایسے مقامی حضرات سے لکھوائے جائیں جو شہر کی ہر ادبی سرگرمی سے اور ماضی کے حالات سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اور جب تمام مقالے ہمیں موصول ہوں تو ہر شہر کے دس مقالوں میں سے ایک مقالے پر کچھ نقد انعام بھی دیا جائے۔ اور بعد میں ان سبھی کی اشاعت کر دی جائے۔ اس طرح ہر شہر کی موجودہ ادبی تاریخ بھی تیار ہوگی اور اردو کا ذوق رکھنے والوں کے لئے حوصلہ افزائی کا سبب بھی ہوگا۔ لیکن جناب، ہماری بدقسمتی کہئے کہ ہم نے مخلص تصور کرتے ہوئے دو چار صاحبان سے مشورہ کر لیا۔ اُف۔ کیا بتاؤں۔ مجھے فلمی ایکٹر قادر خان کی ایک فلم کا سین یاد آ گیا، جس میں وہ اپنے سر پر جوتا مار کر کہتا ہے کہ "ارے، تو میں نے پوچھا کیوں تھا۔" اس لئے ہم نے طے کیا کہ اب آگے جو بھی کریں گے خود ہی کریں گے۔

سوال۔ ۲۵۔ راجستھان اردو اکیڈمی نے اب تک آپ کی کس کس کتاب پر انعام دیا ہے۔ یا کسی اور ادارے سے کوئی انعام ملا ہے۔

جواب۔ "نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ"۔ الحمد اللہ۔ نہ میرے بزرگوں نے کبھی انعام و اکرام کی تمنا کی اور نہ کبھی میرے دل میں اس کا خیال آیا۔ اور خدا گواہ ہے میں نے کسی انعام کی خواہش میں یہ کام نہیں کیا۔ مجھے تو اپنے بزرگوں کی خدمات سے ادب کو روشناس کرانا تھا، وہ کر دیا۔ رہا اردو اکیڈمی کا سوال تو جناب جب سے میں تصنیف و تالیف میں

مشغول ہوا ہوں میں نے اردو اکیڈمی کو معطل شکل میں ہی دیکھا ہے اور وہ آج بھی معطل ہی ہے۔ ہاں میرے کچھ کرم فرماؤں نے مجھے ذاتی طور پر میری حوصلہ افزائی کے لئے توصیف نامے عنایت کئے ہیں۔جیسے خداداد خاں مونس صاحب نے میری ادبی کاوشوں کو سراہتے ہوئے اپنی خوشی سے ایک توصیف نامہ عنایت فرمایا۔اور کچھ قابل قدر حضرات نے مجھے بڑے پیار سے، پیارے پیارے خطابات عطا کئے ہیں۔جیسے ڈاکٹر حسین رضا صاحب نے ''جونیئر کولمبس'' ڈاکٹر ریاض الدین صاحب نے 'مجنون ادب'۔خداداد خاں صاحب مونس نے ''خاور ادب'' وغیرہ وغیرہ۔خلوص دل سے دئے گئے یہ خطابات میرے لئے قارون کے خزانہ سے کم نہیں۔

سوال۔۲۶۔یہ آخری سوال ہے۔کیا آپ اپنے اب تک کے کاموں سے مطمئن ہیں۔اور آپ کا آئندہ اشاعتی منصوبہ کیا ہے۔

جواب۔اس حد تک تو بہت اطمنان ہے کہ میں ان مشاہیر کو ادب میں واپس لا سکا جن کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔آپ اگر میری مرتب کردہ کتب کو دیکھیں تو پائیں گے کہ میرا ۹۵ فی صد کام آزادی سے پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔اور میری چند آنے والی کتب میں بھی آپ کو آزادی سے قبل کے ایسے ہی حضرات کا ذکر ملے گا جو جے پور کے اردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہوئے بھی نظر انداز کئے گئے۔لیکن ابھی مجھے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ایک ایسا کام جو راجستھان میں اب تک کسی نے نہ کیا ہو اور جس سے میرے بزرگوں کا نام قائم رہے۔الحمد اللہ ایسا ایک کام جاری ہے۔لیکن اس کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔فی الحال چند خاص کتب زیر ترتیب ہیں۔جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ تذکرہ شعراء جے پور کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔

۲۔ آزادی کے بعد راجستھان کا پہلا محقق۔سلیم جعفر

۳۔ کلیات سلیم جعفر (مضامین)

۴۔ راجستھان کے منتخب تحقیقی و تنقیدی مضامین، جلد دوم۔

۵۔ جے پور میں اردو ڈرامہ نگاری۔ ریڈیائی ڈراموں تک
۶۔ حکیم عبدالقادر ماہرؔ (تلمیذ قاضی نور احمد تنویرؔ) کے قلمی دیوان کی تدوین
(اس دیوان میں تین ہزار سے زائد اشعار ہیں)
۷۔ جے پور کا مزاحیہ ادب۔ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد
۸۔ مختار الرحمٰن راہیؔ۔ شخصیت اور فن
۹۔ حضرت مفتوں کوٹوی۔ ایک بے نیاز محقق
۱۰۔ ریاست جے پور میں غالب اسکول کی شعری خدمات

دو بہت اہم کتابیں اور بھی ہیں جن کے بارے میں ابھی بتانا نہیں چاہتا۔ جب مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جائیگی، تب ہی ان کو منظر عام پر لاؤنگا۔

شکریہ

شاہد احمد جمالی، جے پور

صدر

راجپوتانہ اردو ریسرچ اکیڈمی، جے پور

جناب نذیر فتح پوری

کی تصنیف 'راجستھان کے چند مشاہیر ادب سے مصاحبہ' کے لئے

قطعہ تاریخ　　خداداد مونس

کیا خوب یہ کتاب جناب نذیر ہے
تحریر میں شگفتگی دلپذیر ہے

اس میں ہے ذکر ایسے مشاہیر کا رقم
جو اپنی اپنی جا ہیں نہایت ہی محترم

قرطاس پر قلم کی زباں میں ہے گفتگو
تحقیق اور تلاش کی گویا ہے جستجو

ماضی کے تجربات میں تحریک حال ہے
جامد اگر نہ ہو تو ادب لازوال ہے

ہے آرزو ادب کے اک ادنیٰ غلام کی
حاصل اسے پسند ہو قبول عوام کی

مونسؔ دعا کرو نئی نسلوں کے ہاتھ میں
محفوظ فکر و فن کے دبستاں سدا رہیں

تاریخ طبع پائی ہے غیبی نوید سے
"اخبار امتزاج قدیم و جدید" سے

(۱۴۳۷ھ)

نذیرؔ فتح پوری کی تصانیف

۱) چٹانوں کے بیچ۔(ناول)۱۹۷۵ء پرواز پبلی کیشنز۔ممبئی

۲) زخم اور آہیں(ناول)۱۹۷۷ء گلکدہ پبلی کیشنز،سہسوان۔بدایوں۔یوپی

۳) بچو!آؤ گیت سنائیں(بچوں کے لیے نظمیں)۱۹۸۳ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۴) لمحوں کا سفر(غزلیں)۱۹۸۵ اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۵) بچو!آؤ گیت سنائیں(دوسرا ایڈیشن)۱۹۸۷ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۶) غزل اندر غزل(آزاد غزلیں)۱۹۸۸ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۷) سفر تا سفر۔(غزلیں)۱۹۹۱ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۸) تیسرا سفر(غزلیں)۱۹۹۳ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۹) لفظوں کے سائے تلے(ادبی مضامین)۱۹۹۵ اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۱۰) ریگِ رواں۔(ہندوستان میں ماہیوں کا پہلا مجموعہ)۱۹۹۷ء
پنجاب مرکز ادب گجراں والا پاکستان

۱۱) اکرام(نعت) بہ اشتراک دلدار ہاشمی۔ریاضؔ بجنوری۔۱۹۹۸ء،اسباق پبلی کیشنز۔پونہ

۱۲) جگن ناتھ آزادؔ: ایک مستقل ادارہ(تصنیف)۱۹۹۸ء محروم میموریل سوسائٹی۔دلّی

۱۳) جہانِ گیتا رضاؔ(رضا کے فکر و فن پر مضامین)۱۹۹۹ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۱۴) غالبؔ، گیتا رضاؔ اور سنجے گوڈبولے(غالبؔ سے متعلق)۲۰۰۰ء،اسباق پبلی کیشنز۔پونہ

۱۵) نیا دن پھوٹ کر نکلا۔(شاعری)۲۰۰۰ء راجستھان اردو اکادمی۔جے پور

۱۶) کوثر صدیقی:فن اور شخصیت۔(اسباق)۲۰۰۰ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۱۷) دلدار ہاشمی : فن اور شخصیت(ترتیب) ۲۰۰۱ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۱۸) مٹھی بھر ماہیے۔وزیر آغا کی نذر(ماہیے)۲۰۰۱ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۱۹) علامہ کالی داس گیتا رضاؔ(اسباق خاص نمبر)۲۰۰۱ء اسباق پبلی کیشنز۔پونے

۲۰) حیدر قریشی: فن اور شخصیت (ترتیب) بہ اشتراک نجے گوڑبولے ۲۰۰۲ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونہ
۲۱) امینِ حزیں۔ شخص شاعر اور استاد (ترتیب) ۲۰۰۳ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۲۲) تاریخ و تذکرۂ فتح پور شیخاواٹی (ساڑھے پانچ سو سالہ تذکرہ) ۲۰۰۳۔ اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۲۳) یہ زمین میری ہے (شاعری۔ ہندی) ۲۰۰۳ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۲۴) مناظر عاشق ہرگانوی کا ادبی منظر نامہ (ترتیب) اسباق پبلی کیشنز۔ پونے ۲۰۰۴ء
۲۵) مرے گیت اکیلے رہ گئے (گیت) ۲۰۰۴ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۲۶) عصمت جاوید شیخ (ترتیب) ۲۰۰۴ء۔ اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۲۷) شعرائے پونہ: ایک تحقیق (تین سو سالہ تذکرہ) ۲۰۰۵ء، اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ۔ پونے
۲۸) ریزہ ریزہ دل (افسانچے) ۲۰۰۵ء۔ اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۲۹) فراز حامدی کے اردو گیت (ترتیب) ادبی دنیا پبلی کیشن جے پور۔ راجستھان۔ ۲۰۰۶ء
۳۰) علامہ کالی داس گپتا رضا کے ادبی سفر (ترتیب) اسباق پبلی کیشنز۔ پونے ۲۰۰۷ء
۳۱) جلیل الٰہ آبادی۔ شخصیت اور شاعری (ترتیب) ۲۰۰۸ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۳۲) اصغر ولوری کی غزلیہ شاعری (ترتیب) ۲۰۰۸ء نرالی دنیا پبلی کیشنز۔ دلی
۳۳) ڈاکٹر ساحر شیوی کا تخلیقی منظر نامہ (تصنیف) ۲۰۰۷ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۳۴) سفر مدام سفر (طویل غزلیں) ۲۰۰۸ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۳۵) ثنائے جلیل (دعا۔ حمد۔ مناجات) ۲۰۰۸ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۳۶) ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیقی منظر نامہ (تصنیف) ۲۰۰۸ء ماڈرن پبلی کیشنز۔ دلی
۳۷) ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا تخلیق منظر نامہ (ہندی) ۲۰۰۹ء ماڈرن پبلی کیشنز۔ دلی
۳۸) ڈھلی ڈھلی شام کا اُجالا (ہندی ناول کا ترجمہ) ۲۰۰۹ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے
۳۹) پونہ میں اردو افسانہ : ایک تحقیق (تحقیق و تنقید) ۲۰۱۰ء اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ۔ پونے
۴۰) امیر تیمور (بچوں کے لیے سوانحی ناول) ۲۰۱۰ء۔ رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں۔ مہاراشٹر
۴۱) ماں کے نام (انتخاب و ترتیب) ۲۰۱۰ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۴۲) نورالسعید اختر: تحقیق، تنقید، تخلیق (ترتیب) ۲۰۱۰ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۴۳) ڈاکٹر مناظر عاشق اور ژرف گوئی (تنقید) ۲۰۱۰ء۔ ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس۔ دلّی

۴۴) آزاد بنام نذیرؔ (جگن ناتھ آزاد کے ۳۹ خط۔ نذیر فتح پوری کے نام) ۲۰۱۱ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۴۵) مثنوی جواب زہر خند (مثنوی) ۲۰۱۱ اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۴۶) امیر تیمور ہندوستان میں (بچوں کے لیے سوانحی ناول) ۲۰۱۱ء رحمانی پبلی کیشنز۔ مالیگاؤں

۴۷) اردو کا اثر راجستھانی بولیوں پر (قومی کونسل اردو دلّی کا پروجیکٹ) ۲۰۱۱ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۴۸) پونے سے رانچی کا سفر (سفرنامہ) ۲۰۱۱ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۴۹) کلیاتِ آزاد سیکری (راجستھان کے اہم شاعر عبداللہ آزاد کی شاعری) (ترتیب) ۲۰۱۲ اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۵۰) تتلیوں بھرا آسمان (غزلیں) ۲۰۱۲ اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۵۱) دیوان نذیرؔ فتح پوری (غزلیں) ۲۰۱۲ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۵۲) مختلف الجہات شخصیت: ملک تاسے (ترتیب) ۲۰۱۲ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۵۳) میخانۂ اردو کا پیر مغاں نارنگ ساقیؔ (ترتیب) ۲۰۱۲ء۔ ایم آر۔ پبلی کیشنز۔ دلّی

۵۴) اعتراف (ادبی مضامین) ۲۰۱۲ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۵۵) چنتن منچ کے شاعر۔ بہ اشتراک اُدھو مہاجن بسمل (ہندی)۔ ۲۰۱۲ء۔ اسباق پبلی کیشنز

۵۶) گوپی چند نارنگ: ایک ہمہ جہت شخصیت۔ بہ اشتراک محبوب راہی۔ ۲۰۱۳ء۔ ایم آر پبلی کیشنز۔ دلّی

۵۷) میرا دیش مہان (بچوں کے لیے ۲۳ کہانیاں) ۲۰۱۳ء رحمانی پبلی کیشنز۔ مالیگاؤں

۵۸) میری شاعری میں جانور (تنقیدی جائزہ) ۲۰۱۴ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۵۹) نظم سفر (پابند نظمیں) ۲۰۱۴ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۶۰) مناظر صاحب کتابیں ملیں (مکتوبی تبصرے) ۲۰۱۴ء ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس۔ دلّی

۶۱) ارشد مینا نگری: ہندوستانی ذہن وتہذیب کا نمائندہ شاعر (تصنیف) ۲۰۱۴ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۶۲) علیم صبا نویدی کے نئے تخلیقی زاویے (تصنیف) ۲۰۱۴ء تامل ناڈو پبلی کیشنز۔ چینئی

۶۳) پشاور کی ۱۷ کہانیاں (بچوں کے لیے) ۲۰۱۵ء رحمانی پبلی کیشنز۔ مالیگاؤں

۶۴) میرے دوہے میرے گیت (ہندی) ۲۰۱۵ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۶۵) مناظر عاشق ہرگانوی کی ہر سانس محمدؐ پڑھتی ہے (جائزہ) ۲۰۱۵ء، ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس، دلّی

۶۶) دیوداس بسمل: حیات اور ادب (مرتب)۔ ۲۰۱۵ء۔ اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۶۷) نذیر فتح پوری بنام سلطان اختر (خطوط) مرتب: یعقوب برکت اللہ، ناشر: مہر فاؤنڈیشن ۲۰۱۵ء

۶۸) مناظر عاشق ہرگانوی کے ''اردو آٹو گراف بک'' پر ناقدانہ نظر۔ ۲۰۱۶ء۔ ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس۔ دلّی

۶۹) دوسرا کالی داس : کالی داس گپتا رضا۔ ۲۰۱۶ء اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

۷۰) میں اور ندا فاضلی۔ ۲۰۱۶۔ رنگِ ادب پبلی کیشنز۔ کراچی پاکستان۔

۷۱) مناظر عاشق ہرگانوی کی افسانچہ دوستی۔ ۲۰۱۶ء۔ ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس۔ دلّی

۷۲) ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی کی فراز شناسی ۲۰۱۶ء۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن، شولاپور

۷۳) محمدؐ نہ ہوتے تو... (نعت)۔ ۲۰۱۶ء۔ اسباق پبلی کیشنز۔ پونے

☆☆

Printed by:

GLOBAL PUBLICATION

220 K.K. Complex, Ramganj Bazar, Jaipur, (Raj.)

Mob: 9460866130, 9460257861 Email : abdulmalik.global@gmail.com